قرضوں کی اشاریہ بندی

[اجتماعی اجتہاد کے اداروں کے کام کا جائزہ]

* محی الدین ہاشمی

❶ تمہید

بنی نوع انسان پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی محدود صلاحیتوں کا دائرہ وسیع کرنے اور انسانی دانش کو جلا بخشنے کے لیے عقلی ہدایت کے ساتھ الہامی ہدایت کا اہتمام بھی فرمایا۔ اس نے ایسے برگزیدہ افراد کو ہادی بنا کر بھیجا جو حقیقی حاکم کے احکام انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ انھی مقدس ہستیوں میں آخری شخصیت حضرت محمد ﷺ کی ہے جن کے ذریعے سے دین کی تکمیل ہوگئی، نیکی اور بدی میں واضح خط امتیاز کھینچ دیا گیا اور بنی نوع انسان کے لیے ہدایت وشفا کی آخری کتاب نازل کی گئی جس کی تعبیر، تفسیر اور توضیح و بیان کا کام نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے کیا۔

دین کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ کتابِ الٰہی نے وہ تمام ضوابط، اصول اور کلیات بتا دیے جو قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ رہا الہامی ہدایت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قیامت تک کے غیر محدود جزئی واقعات میں براہ راست رہنمائی کرے، رہنمائی کے دوسرے ذریعے یعنی عقل کو کلیتاً مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔

قرآن وسنت نے اصول وکلیات کے ساتھ کئی ایک معاملات میں جزوی قانون سازی بھی کی اور کئی "substantive laws" دیے جو صدر اوّل کے ساتھ تمدن کی ضروریات کے لیے کافی تھے لیکن تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات اور مسائل میں اضافہ ہوتا گیا اور ایسی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں جن کے بارے

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک تھاٹ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

میں کتاب وسنت میں براہِ راست ہدایات موجود نہیں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد وحی کا دروازہ بند ہو گیا لیکن امت مسلمہ کسی قانونی بحران سے دوچار نہیں ہوئی۔ قرآن وسنت میں واضح طور پر اس امر کی ہدایات موجود تھیں کہ اہلِ علم کو قانونِ الٰہی کے علل وحکم کا ادراک حاصل کر کے استنباط واستخراج کے ذریعے قانون سازی کرنی چاہیے۔ چنانچہ مسلم فقہا نے بہت قلیل مدت میں ایک مکمل قانونی نظام تشکیل دے دیا جسے عوام وخواص میں اعتبار حاصل تھا۔ نیز اس میں لچک اور ارتقا کی ایسی صلاحیت موجود رہی جس نے اسے تغیراتِ زمان ومکان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا دیا۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے اپنے تمام احکام، شرائع، تعزیرات اور اصولوں میں سختی کے ساتھ جس چیز کو پیش نظر رکھا ہے وہ عدل واحسان ہے۔ تشریع کا اصل مقصد بندگان خدا کے معاملات اور تعلقات کی عدل وانصاف کی بنا پر بایں طور تنظیم کرنا ہے کہ ان کے درمیان مزاحمت اور مقابلہ کے بجائے تعاون اور ہمدردانہ اشتراکِ عمل ہو۔ اسی غرض سے اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی اور حقائق اشیاء کے اس علمِ کلی کی بنا پر، جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، زندگی کے ہر شعبے میں چند ہدایات دی ہیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے عملی زندگی میں نافذ کر کے امت کے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ ہدایات اگرچہ ایک خاص زمانے اور خاص حالات میں دی گئی تھیں مگر ان سے قانون کے ایسے وسیع اور ہمہ گیر اصول نکلتے ہیں جو ہر زمانے اور ہر حالت میں انسانی معاشرے کی عادلانہ تنظیم کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ہر زمانے کے مجتہدین کا کام ہے کہ عملی زندگی میں جیسے جیسے حالات وحوادث پیش آتے رہیں، ان کے لیے اِن اٹل اور ناقابلِ تغیر اصول سے احکام مستنبط کرتے رہیں، اور معاملات میں ان کو بایں طور نافذ کریں کہ شارع کا اصل مقصود پورا ہو۔

اسلامی تاریخ میں اگرچہ فقہی اجتہاد کی شاندار اور بے مثل روایات صدیوں تک موجود رہی ہیں مگر بدقسمتی سے یہ روایات اپنا تسلسل اسی آب وتاب کے ساتھ قائم نہ رکھ سکیں۔ قرن ہا قرن کے جمود کی وجہ سے فقہ اسلامی حالات وزمانہ کے تغیرات کا بایں طور ساتھ نہ دے سکی جو اس کے شایانِ شان تھا۔ البتہ انفرادی سطح پر ضرور ایسی نابغہ شخصیات آتی رہیں جو نئی ضروریات اور مسائل کا حل اپنے اجتہادات کی روشنی میں پیش کرتی رہیں۔ ملت اسلامیہ کی اجتہادی تاریخ میں جو پیش رفت عصر حاضر میں سامنے آئی ہے وہ اجتماعی اجتہاد کے اداروں کے قیام کی صورت میں

ہے۔ یہ ادارے روشنی اور امید کی ایسی کرن ہیں جو رفتہ رفتہ پھیل کر مثلِ خورشید اپنا فیض عام کریں گے اور اس روایت کو دوبارہ زندہ کریں گے جس کی بنا ائمہ مجتہدین نے رکھی تھی۔

❷ موضوع کا تعارف و اہمیت

جدید معاشی نظام میں، بالخصوص زر اعتباری کے رواج اور معاشی عوامل میں سیاسی دخل اندازیاں بڑھ جانے کی وجہ سے، معیشت کے فطری بہاؤ میں بہت سی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کی شرعی حیثیت کا تعین وقت کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ ان کے بارے میں اسلامی فقہ کے ذخیرے میں کوئی واضح اور قطعی حل موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں یہ پیچیدگیاں درپیش نہیں رہیں اور اگر کہیں شاذ و نادر پیش بھی آئیں تو ان میں بھی اس قدر وسعت پیدا نہیں ہوئی کہ باقاعدہ اس وقت کے معاشی نظام کے ساتھ لازم و ملزوم قرار پاتیں، اس لیے آج معاشیات اور مالی معاہدات کے متعلق جو قوانین متداول کتب میں موجود ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے ادارے ان کا نئے سرے سے جائزہ لیں اور عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کریں۔

''مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی'' کا موضوع بھی اسی نوعیت کا حامل ہے جس پر زیرِ نظر مقالہ میں اجتماعی اجتہاد کے اداروں کے کام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

افراطِ زر کا مفہوم

کاغذی زر کی دریافت سے دنیائے معیشت میں بڑا انقلاب وقوع پذیر ہوا۔ اس سے جہاں بڑے بڑے مسائل سلجھے وہاں یہ کئی سنجیدہ مسائل اور پیچیدگیوں کا باعث بھی بنا۔ کاغذی زر کے پیدا کردہ مسائل میں افراطِ زر (Inflation) کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ افراطِ زر کی صورتِ حال اس وقت پیش آتی ہے جب ملک میں اشیاء اور خدمات کی رفتارِ طلب، ملک کی مجموعی پیداوار کی رفتار (رفتارِ رسد) سے زیادہ ہو جائے۔ ہر دو کے اضافے کی شرح میں باہمی اختلاف یا تو مخصوص نظامِ زر کا مظہر ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ زر کی رسد میں خاصا اضافہ ہو جائے، یا پھر اس کی وجوہ حقیقی نوعیت کی ہوتی ہیں مثلاً ایسے عوامل جو پیداواری اضافے میں رکاوٹ پیدا کر دیں یا اس کی طلب میں

اضافہ کر دیں مثلاً قحط، فیکٹری مزدوروں کی ہڑتال وغیرہ۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اگر عمومی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زرِ کاغذی کی قوتِ خرید میں اس کی تخلیق کے بعد سے مسلسل کمی کا رجحان چلا آ رہا ہے اس کے علاوہ ہر بڑی جنگ اور فطری معاشی نظام میں حکومتوں کی مداخلت جیسے عوامل افراطِ زر میں تیز رفتاری (Acceleration) کا موجب بنتے رہے ہیں۔ حقیقی زر کے برعکس چونکہ زرِ کاغذی کی تخلیق کوئی مشکل بات نہیں اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی قدر (Value) میں استقلال رہے اور اس کی قوتِ خرید (Purchasing Power) میں کمی بیشی نہ ہو۔

آج کے دور میں افراطِ زر کے مسئلہ نے ایک عالم گیر وسعت اختیار کر لی ہے اور مؤجل ادائیگیوں میں روپے کی قدر میں ہوشربا کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس بنا پر زر اپنے بنیادی فرائض کی باحسن ادائیگی سے قاصر ہے۔ زر اعتباری کی قدر میں اس بے اعتمادی کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے ماہرینِ معیشت اس کی مسلسل گرتی ہوئی قدر کو ایک انتہائی اہم مسئلہ سمجھنے لگے ہیں۔

افراطِ زر سے پیش آمدہ مسائل

افراطِ زر کے اثرات اور مفاسد کا دائرہ بہت وسیع ہے جو معاملات قرض کے علاوہ تمام مؤجل حقوق اور ذمہ داریوں پر محیط ہے مثلاً نصاب زکوٰۃ، حدود اور دیتوں کی شرعی مقادیر، مہر مؤجل وغیرہ۔ علاوہ ازیں افراطِ زر کئی اجتماعی معاشی مفادات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ افراطِ زر سے پیش آمدہ مسائل مختصراً حسب ذیل ہیں۔

① افراطِ زر کی وجہ سے طویل میعادی مالی معاہدوں پر بالخصوص زد پڑتی ہے۔ چونکہ مستقبل بعید میں افراطِ زر کی شرح کا کچھ بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے بالعموم لمبی مدت پر محیط کئی مختلف النوع منصوبے باوجود اپنی افادی وقعت کے روبعمل نہیں آ سکتے۔

② افراطِ زر سے بچتیں شدید متاثر ہوتی ہیں۔ خاص طور پر ایسے افراد کی بچتوں پر اس کے سخت تکلیف دہ اثرات مرتب ہوتے ہیں جو بڑھاپے، ممکنہ بیماری، ممکنہ بے روزگاری، بچوں کی تعلیم، شادی یا مکان وغیرہ کی تعمیر کے لیے کی جاتی ہیں۔

③ افراطِ زر کا ایک نقصان یہ ہے کہ اس کے اثرات سے سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لیے بچت کنندگان اپنے سرمائے کو املاک، قیمتی اجناس اور اس طرح کے دیگر غیر پیداواری اثاثوں کی شکل میں رکھنے کو قرین

مصلحت سمجھنے لگتے ہیں جس سے معاشی سرگرمیوں پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

④ مقررہ آمدنی والے لوگ اور معاشرے کا متوسط طبقہ افراطِ زر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے کیونکہ اس کی زد اولاً اسی طبقے پر پڑتی ہے۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی بنیادیں روز بروز مستحکم ہوتی ہیں۔ کم اور معینہ آمدنی والا طبقہ مسلسل بدحالی کا شکار ہوتا ہے جب کہ سرمایہ دار طبقے کے پاس ایسے تمام وسائل موجود ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ افراطِ زر کے نقصانات سے اپنے کو محفوظ (Inflation Proof) بنالیتا ہے۔

⑤ آجر اور اجیر کے مابین اجرت کا تعین مستقبل کے متوقع افراطِ زر کے اندازے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اب اس میں ناانصافی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ آجر اور حکومت مستقبل کے افراطِ زر کا اندازہ اپنی بہتر معلومات کی بدولت، فریق مقابل کی نسبت زیادہ صحیح انداز میں کر سکتے ہیں اس لیے سرکاری ملازمین اور عام اجیر، اجرتوں کے معاملے میں بالعموم ناانصافی اور استحصال کا شکار بن جاتے ہیں۔

افراطِ زر کے مفاسد کی وضاحت کے لئے یہاں دو مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

آج سے پندرہ برس قبل زید پر پانچ ہزار زکوٰۃ واجب ہوئی جو اس کے پاس موجود دو لاکھ روپے پر واجب ہوئی مگر وہ اس وقت اس کی ادائیگی نہ کر سکا۔ اب اگر وہ صرف وہی پانچ ہزار روپے بطور زکوٰۃ ادا کر دے تو اس سے مستحقینِ زکوٰۃ کا نقصان ہوگا کیوں کہ اُس وقت کے پانچ ہزار کی قدر آج کے پندرہ ہزار کے برابر ہے۔

دوسری مثال قرض کی ہے۔ مثلاً آج سے دس برس قبل زید نے ایک لاکھ روپیہ بطور قرض بکر کو دیا۔ اب واپسی کے وقت بکر وہی ایک لاکھ روپیہ، (جو دس برس قبل کے ایک لاکھ روپے کے ایک چوتھائی رہ گیا ہے) ظاہری مثلیت کی رعایت کرتے ہوئے واپس کرے گا تو بلاشبہ یہ زید کی حق تلفی اور اس پر ظلم ہوگا۔ دیون مؤجلہ کی ایسی بے شمار مثالیں ذکر کی جا سکتی ہیں جن میں ظاہری مثلیت کی بنا پر ادائیگیاں ہوں تو بے انصافی اور ظلم کی مختلف شکلیں سامنے آئیں گی۔ مہرِ مؤجل کے معاملہ میں بھی ایسی ہی صورتِ حال پیش آتی ہے۔

زر اور افراطِ زر کے ضروری تعارف کے بعد اس امر کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں کیا افراطِ زر کی مثالیں ملتی ہیں؟ نیز زر کی قوتِ خرید میں کمی بیشی سے پیش آمدہ مسائل کا فقہاء نے کیا حل پیش کیا ہے؟

مسئلہ افراط زر کا تاریخی جائزہ

نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں تبادلی نظام کے ساتھ ساتھ زر کا رواج بھی عام ہو چکا تھا۔ اس وقت جن نقود کا چلن تھا وہ سونے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ عرب کے تاجر جن کا باہر کی دنیا سے مسلسل رابطہ رہتا تھا اپنے روزمرہ لین دین میں ان کا وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے۔ اس دور کے نظامِ زر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کرنسی کے تغیرات (Fluctuations) ایسے نہ تھے جنہیں آج کے مشابہ قرار دیا جا سکے۔ زر کی قدر میں واقع ہونے والے تغیرات کا سبب بالعموم قدرتی عوامل بنتے تھے۔ یہ تغیرات چونکہ کسی مربوط نظام کے تابع نہ ہوتے تھے' نیز اس وقت کے زر کے سونے چاندی کی شکل میں ہونے کے باعث یہ تغیرات نہ تو وبائی شکل اختیار کرتے اور نہ ہی کسی ایک جہت میں رہنے کے پابند ہوتے تھے۔(1) یہی وجہ ہے کہ قدرِ زر میں یہ فطری اور معمولی کمی بیشی رائج الوقت معاشی نظام کی ساخت میں کسی بڑی تبدیلی کا باعث نہیں بنتی تھی۔ چنانچہ قدرِ زر میں ہوشربا تغیرات کے ایسے واقعات گزشتہ صدیوں میں نہیں ملتے جن کی دورِ حاضر کی صورت حال کے ساتھ تطبیق ہو سکے۔

عہدِ نبوی ﷺ کے بعد کے ادوار میں' جب ''فلوس'' کا استعمال شروع ہوا اور ملاوٹ والے دراہم و دنانیر کا چلن ہوا' تب قدرِ زر کے تغیرات کا اثر انفرادی نہ رہا بلکہ عام معاشرے پر بھی اس کے اثرات پڑنے لگے۔ جنگیں اور دیگر سیاسی بحران' اشیاء کی قیمتوں اور زر کی قوت خرید میں کمی بیشی کا موجب بننے لگے۔ 74ھ میں خلافتِ عبدالملک بن مروان کے دوران غالباً پہلی مرتبہ اس طرح کا تغیر واقع ہوا' جب خلیفہ نے عراق میں اسلامی نقود (سکے) کی جاری کا حکم دیا' جب کہ اس سے قبل رومی دینار اور کسروی دراہم استعمال کیے جاتے تھے۔(2) یہ سلسلہ بعد کے زمانے میں جاری رہا اور مختلف مواقع میں نقود کی قیمتوں میں تغیرات واقع ہوتے رہے۔(3) علاوہ ازیں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملاوٹ والی کرنسی کا چلن بھی رہا اور کئی طرح کی ملاوٹ والی کرنسیاں رائج رہی ہیں مثال کے طور پر "مبهرجه" ایک کرنسی تھی جس میں چاندی بہ نسبت کھوٹ کے کم ہوتی تھی' اسی طرح "زیوف" جن میں ملاوٹ نسبتاً کم تھی اور تاجر بالعموم اسے قبول کر لیتے تھے۔ البتہ بیت المال اسے قبول نہیں کرتا تھا' اسی طرح "سوقه" میں ملاوٹ کی مقدار زیادہ ہوتی تھی(4) اسی طرح "عدالی "(5) "غطارفه "(6) اور "دراهم بخاريه" جو کہ مخصوص طرز کے فلوس ہوتے تھے(7) اسی طرح "طبريه" اور "پذيريه" میں بھی کھوٹ کی مقدار زیادہ ہوتی تھی(8) اسی طرح

"ھروی" جو کھوٹ ملے ہوئے سونے سے بنے ہوتے تھے(9)

مختلف تاریخی ادوار میں حکومتیں ان تغیرات کے نتیجے میں اقتصادی و سیاسی مشکلات سے دوچار رہیں۔ بالخصوص خلافت عثمانیہ میں دسویں صدی ہجری کے دوران ان مشکلات و مسائل میں خاصا اضافہ ہوگیا' اور زر کے روز مرہ قدری تغیرات' بیوع آجلہ وغیرہ کے سلسلے میں کئی طرح کے اشکالات پیدا کرنے لگے' جن کی طرف اس زمانے کے فقہی فتاویٰ میں اشارات ملتے ہیں۔

زرِاعتباری کے رواج سے جدید معاشی نظام میں کئی ایسے مسائل سامنے آئے ہیں جو فقہِ اسلامی کے ذخیرے میں زیرِ بحث نہیں آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے عصر تدوین میں یہ مسائل درپیش نہیں ہوئے تھے۔ اگر کہیں شاذ و نادر یہ مسائل سامنے آئے توان میں بھی اس قدر وسعت پیدا نہیں ہوئی کہ یہ اس وقت کے معاشی نظام کے مسائل میں زیادہ قابل توجہ بن سکتے۔ چنانچہ معاشیات اور مالی معاہدات کے متعلق جو قوانین متداول کتب فقہ میں موجود ہیں ان پر آج بذریعہ اجتھاد یقیناً بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے۔

موضوع ہذا پر اولین علمی کام

مؤجل ادائیگیوں میں قدر زر کی کمی کے اثرات پر قدیم فقہی ادب میں جو اہم فقہی مباحث سامنے آئے ہیں ان میں سب سے پہلی قابل ذکر تحریر غالباً خطیب تمرتاشی' محمد بن عبداللہ بن احمد" (939-1004ھ) کی ہے جو "بذل المجهود فی مسألة تغيير النقود" کے نام سے موسوم ہے۔ بعد کے فقہاء کی اس باب میں کاوشوں کا مبنیٰ بھی یہی تحریر رہی۔ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل (1216ھ) میں "شیخ عبدالقادر الحسینی" نے ایک رسالہ بعنوان " رسالة فی تراجع سعر النقود بالأمر السلطاني" لکھا جو اس باب میں ایک اہم تحریر ہے۔ اس رسالہ میں حنفی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں 1230ھ میں 'ابن عابدین نے ایک رسالہ تحریر کیا' جس کا نام "تنبيه الرقود علی مسائل النقود " ہے۔ ابن عابدین نے اس رسالہ میں تمرتاشی کے رسالہ کی تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے بھی کیے۔

زرِ اعتباری کی نقدی و شرعی حیثیت

زرِ حقیقی اور زرِ اعتباری

حقیقی زر کی یہ خاصیت ہے کہ اس کی قدر (Value) ذاتی ہوتی ہے، یعنی کسی کی تعیین کی محتاج نہیں ہوتی۔ حقیقی یا خلقی زر کی اس فطری صلاحیت کی بنا پر اس کی قدر کو کالعدم نہیں کیا جا سکتا۔ بالفرض حکومت اس کے زر ہونے کی حیثیت کو ختم بھی کر دے تب بھی اس کی قدر بطور جنس (Commodity) برقرار رہتی ہے، کیوں کہ سونا چاندی اپنی قوت خرید کے علاوہ بھی مستقل افادیت رکھتے ہیں۔ قرنہا قرن تک ان کے بطور معیار قدر استعمال میں یہی حکمت کارفرما رہی ہے کہ یہ اصلاً و خلقتاً زر ہیں اور ان کی قدر و قیمت میں تغیرات کا وقوع بہت نادر ہے۔

مقادیر شرعیہ کی تعیین کے لیے سونے چاندی کے انتخاب میں یہی حکمت کارفرما ہے کہ ان کی قدر بنسبت دوسری اشیاء کے زیادہ مستحکم ہے۔ سونے چاندی کی اس استحکام قدر کے برعکس، کاغذی نوٹ کی صرف پچاس ساٹھ سال قبل اور آج کی قدر کا موازنہ کیا جائے تو آج اس کی قدر پچاس سال پہلے کے مقابلے میں ہزارواں حصہ بھی باقی نہیں رہی۔ اسی بنا پر زرِ حقیقی اور سامان (Commodities) میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ ان کے مبادلے اور قرض میں مثلیت ہی معتبر ہوگی۔(10)

کاغذی زر کی نوعیت اس لحاظ سے حقیقی زر سے بالکل مختلف ہے، ذاتی حیثیت میں اس سے نہ پیٹ بھرتا ہے، نہ بدن ڈھکتا ہے، نہ یہ زیب و زینت کے کام آ سکتا ہے۔ اس کرنسی کے قبول عام کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ حکومت اس کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ گویا اس زر کی قبولیت اور قدر، اعتبار، قانون، طاقت اور رواج پر مبنی ہوتی ہے۔ نیز چونکہ اس کی قدر ذاتی نہیں ہوتی لہٰذا اس کی قدر اس کے وزن کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں حقیقی زر کے برعکس حکومت اگر اس کی نقدیت کو ختم کر دے تو وہ بالکل بے قدر و قیمت ہو کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ماہرین معیشت نے زر کے جو بنیادی وظائف بیان کیے ہیں ان میں سے اکثر کاغذی زر میں مفقود ہیں۔ یہ نہ تو موجل ادائیگیوں میں معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی قدر کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نوٹوں کی قدر کم ہوتی رہتی ہے اس لیے بجائے اس کے کہ وہ خود قیمتوں کے لیے معیار بنیں، اشیاء (Commodities) ان نوٹوں کی قدر متعین کرنے کے لیے معیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فقہاءِ امت نے زرِ حقیقی اور زرِ کاغذی کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے زکوۃ اور دیگر مالی نصابات میں کاغذی زر کو بطور معیار معتبر نہیں سمجھا بلکہ اسے سونے چاندی اور دیگر حقیقی قدر کی حامل اجناس سے وابستہ کیا ہے تا کہ اس زر کے تغیرات شریعت کے مقتضا کو مجروح نہ کر سکیں۔ قدیم علماء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے وقت میں فلوس کو بھی حقیقی زر اور درہم و دینار کے مشابہ قرار نہیں دیا(11)۔ امام شافعی نے کتاب الام میں لکھا ہے:

''سونا چاندی ہر چیز سے الگ ہیں' ان پر کسی بھی دوسری شے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا'' (12)

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زر اعتباری اگرچہ حقوق' التزامات اور ثمنیت کے اعتبار سے کار آمد ہے مگر اس کے باوجود ان تمام وظائف کی ادائیگی سے قاصر ہے جو زرِ حقیقی کے لوازمات شمار ہوتے ہیں۔

کاغذی زر کی شرعی حیثیت

کاغذی زر اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں حقیقی زر میں نقد پذیر (Convertable) تھا۔ نوٹ دراصل بنک کے ذمہ اس کے حامل کے واجب الادا قرض کی سند تھا۔ اس طرح اس کی قانونی اور رواجی حیثیت ایک وثیقہ اور حوالہ کی تھی۔ تب علماء نے بھی بالعموم فقہی مسائل میں اسے سند اور حوالہ ہی قرار دیا اور نوٹ کی مالیت و نقدیت کا انکار کرتے ہوئے یہ فتوی دیا کہ نہ تو کاغذی نوٹ پر زکوۃ واجب ہے اور نہ اس پر احکام ربوا کا اطلاق ہوتا ہے۔ قدیم علماء کے فتاوی میں یہ چیز دیکھی جا سکتی ہے (13) فقہی اصطلاح میں نوٹ ''حوالہ'' کہلایا' نوٹ ادا کرنے والا ''محیل'' وصول کرنے والا ''محتال'' اور بنک ''محتال علیہ'' کہلایا۔ (14)

بعد میں جب حکومتوں نے سونے چاندی کی مقررہ مقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے زیادہ نوٹ چھاپنے شروع کر دیئے تو نوٹ کی حیثیت محض قانونی والزامی (Inconvertable) رہ گئی۔ اب بنک اس کے بدلے سونا یا چاندی دینے کا پابند نہیں ہے۔ کرنسی نوٹ پر اگرچہ ادائیگی کا وعدہ ضرور لکھا ہوتا ہے مگر یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''درست طور پر یہ بتانا کہ نوٹ پر لکھے الفاظ ''مرکزی بنک کا جاری کردہ'' کا کیا مفہوم ہے' بہت مشکل ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں کرنسی نوٹ پر بھی اسی طرح کی عبارت لکھی ہوتی

ہے' مگر اس سے مرکزی بنک کی کوئی بامعنی ضمانت مراد نہیں ہوتی۔ اگر اس کرنسی کا حامل اسے لے کر بنک جائے تو ماسوائے اس کے کہ ان کے بدلے اسی قیمت کے حامل دوسرے نوٹ ملیں' وہ اور کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا۔ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اسی طرح کی صورت حال ہے'' (15)۔

پس دور حاضر کے رواج کے مطابق نوٹ کو حوالہ اور زر خلقی کی سند نہیں کہا جا سکتا۔

مختلف ادوار میں اہل علم نے نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق جو آرا دیں وہ حسب ذیل ہیں۔

① نوٹ نہ تو سامان ہے اور نہ مال ہے بلکہ اس کی حیثیت سند اور وثیقہ کی ہے (16)۔

② دوسرا نظریہ پہلے نظریہ کے برعکس ہے۔ یعنی نوٹ کی حیثیت مال اور سامان کی ہے۔ نوٹ مال متقوم ہیں جن کی قدر عرف کی وجہ سے ہے۔ ان کی مثال ہیرے جواہرات کی ہے جن کی حیثیت سونے چاندی کے بجائے مال اور سامان کی ہوتی ہے (17)۔

③ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ کاغذی نوٹ سونے چاندی کے دراہم و دنانیر کے قائم مقام ہیں۔ نہ تو وہ محض سند و حوالہ ہیں' نہ یہ سامان کے حکم میں ہیں اور نہ ہی ان میں بذات خود ثمنیت پائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ عرف و رواج کی وجہ سے یہ نوٹ اصل ثمن (سونے چاندی) کے قائم مقام اور اس کا بدل ہیں لہذا جو احکام اصل اور مبدل عنہ کے ہوں گے وہی اس کے قائم مقام اور بدل کے ہوں گے کیونکہ بدل کے اندر مبدل عنہ کے احکام جاری ہوا کرتے ہیں (18)۔

④ چوتھا نظریہ یہ ہے کہ روپے دراصل سکوں کے حکم میں ہیں۔ ان کی حیثیت سامان کی ہے نہ محض وثیقہ و سند کی بلکہ ان کی حیثیت اثمان مروجہ کی ہے (19)۔

کاغذی کرنسی کی نقدی حیثیت اور اس کے مال ہونے پر اب تقریباً اتفاق ہے' اس لیے اس پر وجوب زکوٰۃ اور وقوع ربا کے احکام بلا تردد جاری کیے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ اس کی قدر کی بے ثباتی اور تغیرات کا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی کیا اس پر حقیقی زر کے تمام احکام کا اطلاق ہوگا یا نہیں' یا دوسرے لفظوں میں کیا مؤجل ادائیگیوں (Deferred Payments) میں حقیقی زر کی طرح اس میں بھی بہر حال عددی مثلیت کا لحاظ رکھا جائے گا یا ان میں

حقیقی قدر ملحوظ رکھی جائے گی۔ یہ مسئلہ عصرِ حاضر میں انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور آج غیر سودی نظام کے اجرا کی جو کاوشیں ہو رہی ہیں ان کے ضمن میں اس مسئلے کا شافی حل ملت اسلامیہ کے اجتہادی اداروں کی ترجیحی ذمہ داری ہے۔

❹ موضوع ہذا پر متقدمین اور متاخرین کی آراء

فقہاء نے تغیراتِ زر کی بحث کرتے ہوئے زرِ خلقی اور زرِ اعتباری کے الگ الگ احکام بیان کیے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

زرِ خلقی کے تغیرات

زرِ خلقی استقرارِ قدر کے اعتبار سے ہمیشہ زرِ اعتباری سے ممتاز رہا ہے اور سخت کساد کے حالات میں بھی سونے چاندی اور ان کے سکوں کی قیمت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اگر بالفرض قیمت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع بھی ہو جائے تب بھی، باعتبار جنس، ان کی افادیت برقرار رہتی ہے، اس لیے کہ سونا ایک ایسی شے ہے جس کی منفعت ذاتی ہے۔ دیگر مطعومات، ملبوسات وغیرہ کی مانند اس کی ذاتی افادیت، (یعنی زیب و زینت) قیمت کی کمی بیشی کے باوجود بھی، ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ اسی بنا پر فقہاء نے قرضوں وغیرہ میں زرِ خلقی کے تغیرات کا اعتبار نہیں کیا، اور یہ تسلیم کیا کہ چاہے اس کی قوتِ کم یا زیادہ ہو جائے یا حاکم وقت اس کے راوج پر بالکل پابندی عائد کر دے تب بھی اس کے اثرات قرضوں پر نہیں پڑیں گے۔ اسی طرح اگر زرِ خلقی کے اجراء کنندگان (Issuing Authority) اس کی قیمت میں کمی یا اضافہ کر دیں تب بھی قرضے اس سے متاثر نہ ہوں گے (20)۔

زرِ اعتباری کے تغیرات

ائمہ اربعہ کے ادوار میں زرِ اعتباری، کاغذی نوٹ کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ اس وقت "فلوس" زرِ قانونی کے طور پر رائج تھے۔ آج کے کرنسی نوٹ کی طرح ان فلوس کی حقیقی قدر بھی ان کی قانونی قدر کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی۔ ذیل میں کے تغیراتِ قدر سے متعلق فقہاء کی آراء کی تفصیل پیش کی جائے گی تاکہ زرِ اعتباری کی مختلف اشکال و صور، جو آج کے دور میں رائج ہیں، کا حکم معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

فقہاء امت میں فلوس کے تغیرات کا مسئلہ خاصا مختلف فیہ رہا ہے۔اس اختلاف کی بنیاد دراصل اس امر پر تھی کہ فلوس کی حقیقت (Nature) کیا ہے؟ آیا یہ اثمان ہیں یا عروض؟ چنانچہ اس اختلاف کی بنا پر فقہاء نے تغیر فلوس کے مختلف حالات وصور کے لیے مختلف احکام ذکر کیے ہیں۔اس بحث کو واضح اور سہل الفہم کرنے کی غرض سے یہاں تغیر فلوس کے مختلف احوال کی تقسیم کی جاتی ہے اور ان سے متعلق فقہی آراء کو یہاں نقل کیا جاتا ہے (اس موقع پر چونکہ اختلاف فقہاء کی تفصیل ہمارا موضوع بحث نہیں اس لیے اجمالاً ہی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اکثر مآخذ کی نشاندہی پر اکتفا کیا گیا ہے، جہاں سے تفصیل کے لیے رجوع کیا جاسکتا ہے۔)

اعتباری زر کے تغیرات کی فقہاء نے تین صورتیں بتائی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حالتِ کساد

''کساد'' اصطلاح فقہاء کی رو سے کرنسی کے ملک میں ترکِ استعمال اور عدمِ رواج کا نام ہے (21)۔حالتِ کساد میں اگر کسی شخص نے معین اور معلوم قیمت پر کوئی چیز خریدی، یا کسی سے قرض لیا یا اس کے ذمہ مہر مؤجل واجب ہو گیا مگر ادائیگی سے قبل ہی وہ نقد (فلوس) کساد کا شکار ہو گیا تو مدیون پر کیا واجب ہوگا؟ اس بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خرید وفروخت کے معاملات میں قیمت ادا کرنے سے پہلے اگر متعین کرنسی متروک ہو جائے تو بیع فاسد ہو جاتی ہے۔اس لیے کہ فلوس کی حیثیت لوگوں کے ترک استعمال کی وجہ سے اب ثمن کی نہیں رہی۔ اور بیع بلاثمن فاسد ہوتی ہے اور خریدار پر مالِ تجارت کی واپسی لازم ہو جاتی ہے (22)۔

جہاں تک معاملہ قرض یا مہر مؤجل کا تعلق ہے تو اس صورت میں مقروض کے ذمہ وہی فلوس ہوں گے جو بوقت عقد طے پائے تھے، اگرچہ وہ متروک ہو چکے ہوں (23) یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے (24)۔امام ابو یوسف، امام محمد (25)، حنابلہ (26) اور بعض مالکیہ (27) کا مسلک یہ ہے کہ فلوس کے متروک ہو جانے سے بیع باطل نہیں ہوتی اور خریدار کو یہ اختیار بھی نہیں رہتا کہ وہ اس شے کی مثل واپس کرے۔ بلکہ اب اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان فلوس کی قیمت (یعنی رائج نقد میں) ادا کرے جو معاہدہ کے وقت طے ہوئے تھے۔ مذکورہ فقہاء نے قرض وغیرہ کی صورت میں بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ قرض خواہ نے مقروض کو ایک ایسی شے دی تھی جو

حامل منفعت تھی اب اسے ایک بے کار اور بے فائدہ شے کی واپسی یقیناً ظلم شمار ہوگی۔ ابن قدامہ نے معاملہ قرض کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر قرض فلوس کی شکل میں ہو اور حاکم انہیں منسوخ کر دے تو مدیون پر فلوس کی قیمت ادا کرنا ہو گی اس لیے کہ ثمن میں جو عیب واقع ہوا ہے وہ مدیون ہی کی ملک میں واقع ہوا ہے۔ (28)

آگے اس مسئلہ میں کہ قیمت کی تعیین کے لیے کون سے وقت کا اعتبار ہوگا۔ امام محمد رحمہ اللہ (29) نے دیگر حضرات سے اختلاف کیا ہے۔ آپ کے ہاں مقروض پر متروک کرنسی کی وہ قیمت واجب ہے جو اس کے ترک یا اس کے استعمال پر پابندی کے وقت تھی۔ جب کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک خریداری کے معاہدے کے وقت جو قیمت تھی وہ ادا کی جائے گی (30)۔ اکثر احناف نے ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے کو ترجیح دی ہے (31)۔

حالتِ انقطاع

انقطاعِ نقد کا مفہوم یہ ہے کہ نقد لوگوں کے ہاں سے مفقود ہو جائے اور کہیں دستیاب نہ رہے (32)۔ ایسی صورت میں کہ اگر کسی نے ایک معین قیمت پر کوئی چیز خریدی یا قرض لیا مگر ادائیگی سے قبل وہ نقد منقطع ہو گیا، جس پر عقد طے پایا تھا، فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ حنابلہ (33) اور محمد بن حسن الشیبانی کی رائے یہ ہے کہ انقطاع کی صورت میں خریدار اور مقروض پر قیمت لازم ہوگی اور انقطاع نقد سے فوراً پہلے کے وقت جو قیمت ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ احناف کے ہاں اسی قول پر فتویٰ ہے۔ (34) اس مسلک کی دلیل یہ ہے کہ انقطاع کے وقت ہی دین کا مثل سے قیمۃ کی طرف انتقال ہوتا ہے (35) اس لیے اسی وقت کا اعتبار قرینِ مصلحت و صواب ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ البتہ ان کے نزدیک قیمت اس دن کی معتبر شمار ہوگی جس دن فریقین میں عقد طے پایا تھا۔ اس لیے کہ اسی وقت دین کا وجوب تحقق ہوا تھا (36)۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک انقطاع سے بھی عقد اسی طرح ختم ہو جاتا ہے جس طرح کساد سے ختم ہو جاتا ہے (37)۔

حالت غلاء و رخص

زرِ اعتباری کی قوتِ خرید میں تبدیلی کے باعث عام طور پر اس کی قدر میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، جسے غلاء و رخص کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا عام طور پر زر کے بارے میں حکومت کی پالیسی کی بنا پر، اور کبھی دیگر عوامل کی وجہ سے ہوتا

ہے۔ دیونِ مؤجلہ میں اکثر اوقات وقوعِ عقد اور ادائیگی کی درمیانی مدت میں یہ رخص وغلاء واقع ہو جاتا ہے جس سے متعاقدین کے حقوق متأثر ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر آیا دیون والتزامات میں رخص وغلاء کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کی آراء حسب ذیل ہیں۔

جمہور فقہاء یعنی امام ابوحنیفہ (38)، مالکیہ (39)، شافعیہ (40) اور حنابلہ (41) کے نزدیک رخص وغلاء کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ جو نقد مقروض کے ذمہ واجب ہو بعینہٖ وہی ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں کمی بیشی جائز نہیں ہے (42) ان ائمہ کے بقول فلوس کی قیمت جس قدر چاہے کم یا زیادہ ہو جائے اس کا عقد پر کچھ بھی اثر نہیں پڑے گا۔ اسی بات کی وضاحت حنبلی مسلک کے "مجلة الأحكام الشرعية" میں بھی کی گئی ہے کہ تمام دیون، أثمان، اجرتوں، عوض خلع وعتق وعوض متلف میں جب کہ وہ مؤجل ہوں یہی حکم جاری ہوگا (43)۔

امام ابو یوسف کا مسلک یہ ہے کہ مؤجل مالی عقود میں، فلوس کے رخص وغلاء کی صورت میں، قیمت کی ادائیگی رائج کرنسی میں واجب ہوتی ہے۔ اور کساد وانقطاع کی صورتوں کی طرح یہاں بھی عقد باطل نہیں ہوگا۔ آپ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ فلوس کی ثمنی حیثیت لوگوں کے مابین ان کی رواج پذیری کے باعث ہوتی ہے، اس لیے جب لوگوں کا رواج بدل جائے یا ان کے رواج میں تغیرِ صفات واقع ہو جائے تو اصولاً اس تغیر کی رعایت لازم ہوگی۔

حالتِ رخص وغلا میں جب قرض کی صورت ہو تو قبضے کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور خرید وفروخت کی صورت میں معاہدے کے وقت کی قیمت معتبر سمجھی جائے گی (44) حنیفہ کے ہاں یہی مسلک مفتی بہ ہے۔ (45) اس سلسلے میں بعض مالکیہ نے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ اگر فلوس کی قدر میں زیادہ تغیر واقع ہو جائے تب تو مقروض پر قیمت واجب ہو جائے گی۔ مگر تغیر اگر معمولی ہو تو پھر مثل ہی واپس کرنا ہوگا (46)۔

عصر حاضر میں افراط زر کے بے تحاشا پھیلاؤ کے پیش نظر یہ مسئلہ کئی محققین کی توجہ کا مرکز بنا اور اس پر ان کے مقالات سامنے آئے۔ ان مقالات کے علاوہ اس موضوع پر متاخرین کی آراء کا اہم ذخیرہ اجتماعی اجتہاد کے اداروں کے کام کے ضمن میں دستیاب ہے جس کی تفصیل الگ عنوان کے تحت دی گئی ہے۔ یہاں دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا کا صادر کردہ فتویٰ نقل کیا جاتا ہے جو دارالعلوم کے صدر شعبہ افتاء مولانا مفتی نظام الدین کا تحریر کردہ ہے۔ استفتاء یوں تھا:

''ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے پاس سے دس ہزار روپے بطور قرض لیے اب وہ آدمی اس کا قرض دس سال بعد ادا کرتا ہے۔ اس درمیان میں سرکاری طور پر روپیہ کی قیمت آدھی گھٹا دی گئی ہے۔ یعنی آج سے دس سال پہلے روپیہ کی جو قیمت تھی وہ آج اس سے آدھی رہ گئی ہے جس کا سرکاری طور پر اعلان بھی ہو چکا ہے جس کو سرکاری اصطلاح میں ڈی ویلیویشن کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرض لینے والا دس ہزار روپے ادا کرتا ہے' لیکن ان کی قیمت جن روپوں میں قرض لیا تھا اس کے مقابلہ میں پانچ ہزار رہی ہے تو کیا قرض دینے والا اسی بنیاد پر اس سے بیس ہزار کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ شرعاً سود کہلا سکتا ہے؟ قرض کی لین دین نوٹوں کی شکل میں ہوئی تھی اور قیمت کی تقلیل بھی نوٹوں میں ہوئی۔

جواب: اس قرض میں لیے ہوئے نوٹوں کی' قرض لینے کے زمانہ میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا تھا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادا ملیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے۔ پس نقدان میں جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اور نوٹ اس کے تابع ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (47)

مجلس فقہ اسلامی انڈیا نے مہر مؤجل کے بارے میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ مجلس نے دسمبر ۱۹۸۹ء کے اجلاس میں تجویز کیا کہ: ''مہر کو سونے چاندی کے ساتھ وابستہ کیا جائے تاکہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہنچے۔'' (48)

❺ اجتماعی اداروں کے کام کا جائزہ

''دیون مؤجلہ کی اشاریہ بندی'' جدید معاشی مسائل میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو اجتماعی اجتہاد کے بیشتر اداروں میں زیر بحث رہا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل افراط زر کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر سامنے آیا ہے جس نے اب ایک عالم گیر وسعت اختیار کر لی ہے۔ اس کے نتیجے میں کرنسی کی قدر میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے اور مؤجل ادائیگیاں بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔

عصر حاضر میں جب یہ مسئلہ شدت کے ساتھ سامنے آیا تو اس پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت محسوس ہوئی اور مختلف اجتہادی اداروں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس سلسلے میں اجتہادی اداروں کی آراء کا ماحصل پیش کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان نے ماہرین معاشیات اور ممتاز بنک کاروں پر مشتمل ایک پینل نومبر 1977ء میں قائم کیا تھا تا کہ سود کی متبادل اساس کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پینل نے اپنی رپورٹ فروری 1980ء میں پیش کی جس میں قرضوں اور بچتوں کے انڈکس کو بطور سود کی متبادل اساس کے قبول نہیں کیا گیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ سے متعلقہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''جہاں تک کوئی چیز ادھار دینے اور لینے کا تعلق ہے، شریعت کے مطابق نقدی کی صورت میں لین دین اور جنس کی صورت میں لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کی کسی شے کی جو مقدار ادھار لی گئی ہے وہی مقدار واپس کی جائے خواہ اس عرصے کے اندر اس کی قیمت میں کتنی ہی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک من گندم ادھار لی گئی ہے تو قرض دار کو گندم کی اتنی ہی مقدار واپس کرنی پڑے گی خواہ اس کی قیمت تیس روپے سے بڑھ کر پچاس روپے فی من ہو گئی ہو یا کم ہو کر صرف پندرہ روپے رہ گئی ہو۔ اس طرح اگر نقدی کی کوئی خاص مقدار قرض لی گئی ہو، جیسے ایک ہزار روپیہ، تو قرض دار کو ایک ہزار روپیہ ہی واپس کرنا ہو گا خواہ اس عرصے میں دوسری اجناس اور خدمات کی نسبت سے روپے کی قیمت کتنی ہی تبدیلی آ چکی ہو'' (49)

اسلامی نظریاتی کونسل نے مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کا جائزہ سود کی متبادل اساس کے طور پر لیا ہے حالانکہ موضوع ہذا کا تعلق سود کی متبادل اساس کے مسئلے سے نہیں ہے بلکہ قدر زر کے تغیرات کی صورت میں اس کی قدر کی تأمین اور فریقین کو زیادتی اور نقصان سے تحفظ فراہم کرنے سے ہے۔

اللجنة الدائمه للبحوث العلميه و الافتاء' سعودی عرب

اللجنة الدائمه للبحوث العلميه و الافتاء' سعودی عرب کی چار رکنی کمیٹی نے اپنے دورہ ثالثہ میں جو ربیع الثانی 1393ھ کو منعقد ہوا میں کاغذی کرنسی کی حقیقت سے متعلق مختلف فقہی اقوال پر بحث کی کہ آیا عصرِ حاضر

میں کاغذی کرنسی کی حیثیت اسناد کی ہے عروض کی، فلوس کی، سونے چاندی کے بدل کی یا نقدِ مستقل بالذات کی؟ نیز اس پر مرتب ہونے والے شرعی احکام کیا ہیں؟

اکثریت نے حسب ذیل قرارداد منظور کی:

کاغذی زر کی حیثیت سونے چاندی کی مانند نقد قائم بذاتہ کی ہے۔ نیز یہ جنس ہے جو جہتِ اصدار کے مختلف ہونے پر مختلف الجنس ہو جاتا ہے۔ کاغذی زر پر حسبِ ذیل احکام مرتب ہوتے ہیں:

① نقدین (سونے چاندی) اور دیگر اقسامِ زر (فلوس وغیرہ) میں جس طرح ربا جاری ہوتا ہے بعینہ اسی طرح کاغذی زر میں بھی ربا جاری ہوتا ہے۔ ان میں ایک ہی جنس کی کرنسی کی تفاضل کے ساتھ بیع جائز نہیں ہے چاہے وہ دست بدست ہو یا ادھار ہو۔

② ان میں زکوۃ اس وقت واجب ہو جاتی ہے جب ان کی قیمت نصابِ زکوۃ کو پہنچ جائے۔

③ سلم اور شرکات میں کاغذی زر کو رأس المال بنانا جائز ہے (50)۔

اللجنة الدائمه للبحوث العلميه والافتاء کی اس قرارداد سے معلوم ہوا کہ نام اور ماہیت میں یکسانیت کے باوجود چونکہ مقام اصدار کے اختلاف کی بنا پر کاغذی زر میں حقیقی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کی قدر یکساں نہیں ہے اس لیے اسے الگ الگ جنس قرار دیا گیا اور اس میں تفاضل کو روا رکھا گیا۔

اسی طرح یہ بھی ایک مسلم امر ہے کہ ایک ہی ملک کے ایسے مختلف کاغذی نوٹ جو بلحاظ قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوں ان کے تبادلے کے وقت بھی برابری ان نوٹوں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں دیکھی جائے گی بلکہ ان نوٹوں کی قیمت کے اعتبار سے دیکھی جائے گی۔ (اگرچہ یہاں محل اصدار بھی ایک ہی ہے)۔ لہذا پچاس روپے کے ایک نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے پانچ پانچ نوٹوں کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ اگرچہ ایک طرف صرف ایک نوٹ ہے اور دوسری طرف پانچ، مگر قیمت کے اعتبار سے پچاس کا ایک نوٹ ان پانچ نوٹوں کے برابر ہے اس لیے باوجود یکہ یہ نوٹ عددی ہیں مگر ان کے آپس میں تبادلہ اور خرید و فروخت کرنے سے بذات خود وہ نوٹ یا ان کی تعداد مقصود نہیں ہوگی بلکہ وہ ظاہری قیمت مقصود ہوگی جس کی وہ نوٹ نمائندگی کرتا ہے۔ لہذا مساوات اس کی قیمت میں ہونی چاہیے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلم فقہاء نے عام اشیاء میں بھی اختلاف حقیقت یا اختلاف قدر کی

رعایت کی ہے اور ایسی مماثل اشیاء جن کی مختلف اکائیوں میں عوارض زمانی ومکانی یا مقام اصدار یا کسی اور بنا پر واضح تفاوت واقع ہو جائے تو ان میں ظاہری تفاضل کو جائز سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ دو مختلف ممالک کی کرنسیاں اگرچہ وہ ہم نام اور ہم شکل ہی ہوں ان کے تبادلے میں عددی مثلیت نہیں دیکھی جاتی' اس لیے کہ ان میں معنوی مماثلت مفقود ہوتی ہے۔ فقہاء کے اس عادلانہ اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آج کے دور میں کاغذی زر کی صورت میں (جس کی قدر افراط زر کی وجہ سے روز افزوں کمی کا شکار ہے) بدرجہ اولیٰ حقیقی قدر کی رعایت کرنا ہوگی اس لیے کہ ایک تو کرنسی کی حقیقت ہی اس کا معیار قدر ہونا ہے دوسرے یہ کہ کرنسی کی قدر میں کمی کے اثرات آج کے دور میں انفرادی نہیں رہے بلکہ اس مسئلے کا تعلق عموم بلوی سے ہے یعنی ہر فرد اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی قانون سازی عمل میں لائی جائے جس سے عدل کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ مذکورہ بالا قرارداد میں اس امر کی جانب توجہ نہیں دی گئی۔

مجمع الفقہ الاسلامی' سعودی عرب

موضوع زیرِ بحث پر سب سے اہم علمی مقالات وہ ہیں جو مجمع الفقہ الاسلامی کے پانچویں اجلاس میں پیش کے گئے جو کویت میں 15-10 دسمبر 1988ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں گیارہ مقالات پیش ہوئے جن میں دیونِ مؤجلہ کی اشاریہ بندی کے سلسلے میں پانچ نقطہ ہائے نظر سامنے آئے جو حسب ذیل ہیں۔

① مثل وعدد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرض ادا کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں قیمت کے تغیرات کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا چاہے افراطِ زر کی شرح کم یا زیادہ ہو۔

② قیمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرض ادا ہوں گے۔ عدد' کیل ووزن میں مثلیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

③ عام احوال میں مثلیت کا اعتبار ہوگا مگر تغیر فاحش جب غبنِ فاحش کی حد تک پہنچ جائے تو قیمت کا اعتبار ہو گا۔

④ جب مقروض اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے مقررہ مدت میں قرض واپس کر دے تو اس سے مثل ہی واپس لیا جائے گا۔ البتہ مقررہ مدت میں عدم ادائیگی کی صورت میں اس سے قیمت کا مطالبہ ہوگا۔

⑤ قرض میں مثلیت مقدار وکمیت کا لحاظ ہوگا نہ کہ مثلیت قیمت و مالیت کا البتہ اجرتوں کی ادائیگی میں مثلیت مقدار وکمیت کے بجائے قیمت و مالیت کا لحاظ ہوگا۔

اجلاس کے آخر میں کثرتِ رائے سے منظور ہونے والی قرارداد (51) البتہ مسئلہ کا کوئی ایسا حل پیش نہ کر سکی جو زمینی اور واقعی حقائق کے لیے گرہ کشا ہو، اس لیے مجمع الفقہ الاسلامی کے آٹھویں اجلاس میں، جو برونائی دارالسلام میں 27-21/جون 1993ء کو منعقد ہوا، اجرتوں اور قرضوں پر افراط زر کے اثرات پر غور کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اجرتوں کو افراط زر کی شرح سے وابستہ کرنا ہی شریعت اسلامیہ کا مقتضا ہے۔ البتہ قرضوں کے بارے میں قابل عمل حل تلاش کرنے کے لئے علومِ اسلامیہ اور علمِ معاشیات کے ماہرین پر مشتمل ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے گا جو زیرِ بحث مسئلے کا دقیق علمی جائزہ لے کر آئندہ کے اجلاسوں میں اپنی تجاویز پیش کرے گا۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل امور کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا گیا:

① دیونِ مؤجلہ کی اشاریہ بندی کے متبادل شرعی طریقے معلوم کرنا۔

② کساد کا مفہوم طے کرنا اور مؤجل حقوق والتزامات میں کاغذی زر کے اثرات کا جائزہ لینا

③ افراطِ زر کی وہ حد جہاں کاغذی زر کو کاسد قرار دیا جا سکے (52)۔

اس کے بعد مجمع الفقہ الاسلامی کا نوواں اجلاس ابوظہبی میں 6-1/اپریل 1995ء میں ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ افراط زر اور زر اعتباری کی قدر سے متعلق مجمع کو جو تحقیقی مقالات موصول ہوئے ان پر غور وفکر کے بعد یہ امر سامنے آیا کہ افراط زر بعض حالات میں کرنسی کی قوت خرید کو تباہ کر دیتی ہے اور مجمع الفقہ الاسلامی کا سابقہ فیصلہ اس مسئلے کا کوئی قابل عمل حل پیش نہیں کرتا، اس لیے:

① مجمع الفقہ الاسلامی کے پانچویں اجلاس کی قرارداد میں استثنائی کی حالات کے لیے گنجائش پیدا کی جائے۔

یا

② استثنائی صورتوں میں کرنسی کو قوت خرید سے وابستہ کر دیا جائے۔ **یا**

③ کرنسی کی قدر کو زر حقیقی یعنی سونے سے منسلک کر دیا جائے۔ **یا**

④ قرض دار اور قرض خواہ کے ضرر کا تعین کر کے طرفین میں صلح واجب (ایسی مقدار کا لازمی تعین جس سے

کسی فریق کو نقصان نہ ہو) کے اصول پر عمل کیا جائے۔ **یا**

⑤ اس امر میں فرق کیا جائے کہ زر اعتباری کی قدر میں منڈی کے قانون رسد وطلب کے باعث فرق پڑا ہے یا حکومت نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے کرنسی کی قیمت کم کر دی ہے۔ **یا**

⑥ اس امر میں فرق کیا جائے کہ قدر زر میں حکومت کی پالیسی کی وجہ سے تبدیلی ہوئی ہے یا اس کا باعث خارجی عوامل ہیں۔

مذکورہ اجلاس میں طے پایا کہ ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے اسلامی مالیاتی اداروں کے تعاون سے ایک علمی وتحقیقی شعبہ قائم کیا جائے جو موضوع زیر بحث میں تخصص کے حامل افراد سے درخواست کرے کہ وہ اپنی تحقیقات ایک ایسی کانفرنس میں پیش کریں جس میں مجمع الفقہ الاسلامی کے بعض ماہرین بھی شامل ہوں(53)۔

بعد ازاں فقہ اکیڈمی نے بحرین میں ہونے والی اپنی تیسری ورکشاپ منعقدہ 23-22 ستمبر 1999ء میں موضوع ہذا پر مزید بحث وتحقیق کے بعد حسب ذیل سفارشات اور تجاویز دیں:

① افراطِ زر واقع نہ ہونے کی صورت میں قرضے جوں کے توں واپس کیے جائیں گے۔ اس صورت میں اشاریہ بندی جائز نہ ہوگی۔

② افراطِ زر کے واقع ہونے کی صورت میں حسب ذیل امور پیشِ نظر رکھے جائیں گے۔

اگر فریقین افراطِ زر کے مستقبل میں امکانی وقوع کے علم کے باوجود آپس میں معاہدہ کر لیں تو وہی رقم واپس ہوگی (جو بوقتِ معاہدہ طے ہوئی تھی) اس لیے کہ فریقین کا معاہدہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے افراطِ زر کے نتائج و عواقب سے جان بوجھ کر صرفِ نظر کیا ہے۔ البتہ بوقتِ معاہدہ فریقین افراطِ زر کے ممکنہ اثرات سے بچاؤ کی خاطر بالوضاحت یہ طے کر سکتے ہیں کہ رقم کی واپسی درج ذیل میں سے کسی ایک صورت میں ہوگی۔

① سونا یا چاندی۔ ② کوئی مخصوص شے یا مجموعہ اشیاء

③ کوئی دوسری کرنسی یا کرنسیوں کا مجموعہ۔

معاملاتِ قرض میں البتہ اس کی اجازت نہیں ہے اس لیے کہ اس صورت میں غرر اور ربا واقع ہوگا۔ تاہم ایسی صورت میں جب کہ افراطِ زر جو کہ بوقت معاہدہ غیر متوقع تھا جو بعد میں واقع ہو گیا' یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے

فی الواقع قرض کی رقم (اس کی قدر) کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ اگر اس کے نتیجے میں قدرِ زر میں ایک تہائی یا اس سے زائد کمی واقع ہوئی ہو تو اسے بڑا تغیر سمجھا جائے گا ورنہ نہیں۔ نتیجتاً اگر غیر متوقع طور پر افراطِ زر واقع ہو جائے تو حسب ذیل امور پیش نظر رکھے جائیں گے۔

اگر افراطِ زر زیادہ نہیں (ایک تہائی سے کم ہے) تو قرض کی رقم جوں کی توں واپس ہوگی۔ لیکن اگر افراطِ زر زیادہ ہے تو قرض خواہ کو اسی قدر رقم کی واپسی باعثِ نقصان ہوگی۔ چنانچہ ازالۂ ضرر ضروری ہوگا جس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فریقین آپس میں باہم طے کر لیں کہ دونوں اس نقصان کو مل کر کس تناسب سے برداشت کریں گے۔ اگر باہمی رضامندی سے معاملہ طے نہ ہو سکے تو مصالحت یا قضاء کے ذریعے اسے طے کیا جائے گا(54)۔

مذکورہ بالا فیصلہ اگرچہ افراطِ زر کے مفسدات سے بچاؤ اور اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے ضرر کے ازالے کا کوئی جامع حل پیش نہیں کرتا تاہم اس فیصلے سے ایک اہم اور بنیادی نوعیت کی پیش رفت سامنے آئی ہے۔

مذکورہ بالا فیصلے میں البتہ ایک بنیادی نوعیت کا سقم رہ گیا ہے وہ یہ کہ افراطِ زر کی شرح اور مدتِ قرض کے اہم تعلق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دس سال کے بعد واجب الاداء ہونے والے قرض کی قدر میں بوقت ادائیگی ایک تہائی کمی اور ایک سال بعد اداء کیے جانے والے قرض کی قدر میں ایک تہائی کمی کے واقعات میں بہت بڑا فرق ہے جسے ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ معاملہ مجمع الفقہ الاسلامی کے آئندہ اجلاس میں پیش کیا جائے اور مناسب فیصلہ صادر کیا جائے۔

فقہ اکیڈمی انڈیا

موضوع زیرِ بحث پر فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر انتظام ایک سیمینار دسمبر 1989ء کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ سولہ علماء کرام نے اپنے علمی مقالات پیش کیے اور کرنسی کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ اس مسئلہ پر کہ مؤخر مطالبات کی صورتوں میں کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا احکام شرعیہ میں اعتبار کیا جائے یا نہیں' شرکائے سیمینار کے درمیان دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ چنانچہ کمیٹی نے تجویز کیا کہ اس مسئلہ کے بارے میں حتمی فیصلہ مزید غور و فکر کے بعد کیا جائے گا۔ البتہ اس سلسلے میں ایک پیش رفت یہ ہوئی کہ اجلاس نے تجویز کیا کہ:

''مہر کو سونے چاندی کے ساتھ وابستہ کیا جائے تا کہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہنچے۔'' (55)

فقہ اکیڈمی نے اپنی قرارداد میں مجمع الفقہ الاسلامی کے پانچویں اجلاس کی مختصر قرارداد کی نسبۃً تفصیل دی ہے تاہم فقہ اکیڈمی نے اس موضوع پر کسی نئی جہت کا اضافہ نہیں کیا۔

وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کا ابتدائی فیصلہ

وفاقی شرعی عدالت نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۱ء میں مسئلہ پر غور کر کے اپنا فیصلہ دیا، جس کی رو سے مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کے نظریے کو قبول نہیں کیا گیا۔ یہ فیصلہ سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا جس کے شریعت اپیلٹ بنچ نے 23 دسمبر 1999ء میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ تاہم سپریم کورٹ نے افراطِ زر کے مفاسد اور اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے قرض خواہ کے نقصان کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ:

''زر'' کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ ذخیرۂ قدر اور مؤجل ادائیگیوں میں ایک قابل اعتماد معیار ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک آسان ذریعۂ مبادلہ ہے' مگر افراطِ زر کی وجہ سے زر اپنے پہلے دو وظائف کو ادا کرنے سے تقریباً قاصر ہو چکا ہے۔ مزید براں افراطِ زر معاشی سرگرمیوں میں بڑھوتری اور ترقی کے امکانات کو بھی کم کر دیتا ہے۔ افراطِ زر کا شکار معیشت جلد ہی دنیا کی دیگر ترقی پذیر اور ترقی یافتہ معاشی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت کھو بیٹھتی ہے۔ کرنسی کی تیزی سے گرتی ہوئی قدر بین الاقوامی طور پر تجارتی توازن اور کرنسی کی شرح مبادلہ کو بھی بری طرح متاثر کرتی ہے۔(56)۔۔۔۔ افراطِ زر کا مسئلہ بلاشبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور علمائے اسلام اور ماہرین معیشت کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کاغذی کرنسی کی قدر افراطِ زر کی صورت میں مسلسل کمی کا شکار رہتی ہے۔ اگر کوئی مقروض جس نے ایک مخصوص رقم بطور قرض لی ہو' طویل عرصے کے بعد اسے قرض خواہ کو واپس کرے تو قرض خواہ اس سے بری طرح متاثر ہوگا'' (57)۔

سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے اصولی طور پر اگرچہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا تاہم اس نے مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کے عدمِ جواز کا فیصلہ صادر نہیں کیا بلکہ اس مسئلے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے حل کے لئے سنجیدہ تحقیق کی ضرورت پر زور دیا(58)۔

سپریم کورٹ کی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی

بعدازاں سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کے مسئلے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے اور اس کے مناسب حل کی تلاش پر زور دیا۔ سپریم کورٹ نے اپنے پہلے فیصلے سے اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھا:

''سپریم کوٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے افراطِ زر اور اشاریہ بندی وغیرہ امور پر بحث کرتے ہوئے فیصلے کے صفحہ 734 پر حسبِ ذیل تصرہ کیا ہے:

185۔ قدرِ زر میں کمی کا معاملہ یقیناً انفرادی اور غیر ادا شدہ قرضوں پر اثر انداز ہوتا ہے جہاں قرض خواہ قدرِ زر میں شدید کمی کے باعث واقعتاً مشکل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے واقعات ترکی، شام، لبنان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں میں ہوئے۔ ہمارے ملک میں بھی روپے کی قدر اس سے کہیں کم ہو چکی ہے جو 1970 سے قبل تھی۔ سوال یہ ہے کہ آیا جس شخص نے 1970 سے پہلے ایک ہزار روپیہ بطور ایک قرض دیا تھا اور جو اسے آج تک واپس نہیں ملا، وہی ایک ہزار روپیہ واپس لے گا؟ جبکہ یہ رقم تب کے 100 روپے سے زیادہ کی قدر نہیں رکھتی؟ یہ سوال اس وقت مزید سنگین ہو جاتا ہے جب مقروض باوجود استطاعت کے قرض واپس نہ کرے۔

186۔ اس مسئلے کے حل کے لئے مختلف حلقوں سے کئی تجاویز سامنے آئی ہیں جن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

الف۔ قرضوں کی اشاریہ بندی کی جائے یعنی مقروض اس قدر اضافی رقم واپس کرے جس قدر اس عرصہ میں افراطِ زر کی شرح میں اضافہ ہوا ہو۔

ب۔ قرضوں کو سونے سے مربوط کر دیا جائے اور یہ فرض کیا جائے کہ جس نے ایک ہزار روپیہ قرض لیا ہے اس نے گویا اس دن کی قیمت کے مطابق اتنی رقم کا سونا ادھار لیا ہے چنانچہ واپسی کے وقت اتنی رقم واپس کرے جس سے اتنا سونا خریدا جا سکے۔

ج۔ قرضوں کو کسی مستحکم کرنسی سے وابستہ کیا جائے جیسے ڈالر۔

د۔ قدر میں واقع ہونے والی کمی کا نقصان قرض خواہ اور مقروض دونوں برابر برابر اٹھائیں۔۔۔ چونکہ افراطِ زر کے عوامل ایسے ہیں جو دونوں کے کنٹرول سے باہر ہیں اس لئے اس نقصان کو دونوں مل کر برداشت کریں۔

187۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلے پر مزید تحقیق درکار ہے جس کا آغاز مختلف علمی حلقوں، بالخصوص اسلامی نظریاتی کونسل اور کمشن فار اسلامائیزیشن آف اکانومی کی جانب سے عدالت کے حتمی فیصلے سے قبل کر دینا چاہیے۔ اس موضوع پر کئی عالمی سطح کے سیمینار بھی منعقد ہوئے ہیں جن میں پیش کئے گئے مقالات کا بھی گہرا تجزیہ کیا جائے۔

188۔ دوسری طرف چونکہ یہ قضیہ نہ تو سود کا جواز فراہم کرتا ہے اور نہ ہی بنکوں کے لین دین میں سود کی کوئی متبادل اساس فراہم کرتا ہے اس لیے اس کیس میں مسئلہ ہذا کو طے کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ نہ ہی چیلنج شدہ قوانین سے متعلق فیصلے کا دارومدار اس پر ہے۔ چنانچہ اس قضیہ کو ہم مزید مطالعہ اور تحقیق کے لئے پیش کرتے ہیں'' (59)

سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلے سے مذکورہ بالا اقتباس پیش کرنے کے بعد بنچ نے یہ قرار دیا کہ:

''سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا تبصرے اور وفاقی شرعی عدالت کے اشاریہ بندی سے متعلق عدم جواز کے فیصلے کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب ہوتا اگر یہ کیس وفاقی شرعی عدالت کو افراطِ زر اور اشاریہ بندی کے قضیے سے متعلق از سرِ نو فیصلہ کرنے کے لئے واپس بھیجا جاتا جیسا کہ خود بنچ نے بھی اس پر تحقیق اور تدقیق کا مطالبہ کیا ہے۔۔۔'' (60)

بعد ازاں سپریم کورٹ نے اپنے پہلے فیصلے میں موجود دیگر کئی کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے اسے مع وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے، غیر مؤثر قرار دیا اور مسئلے کو دوبارہ غور کے لیے وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کر دیا۔

دیگر کئی اجتہادی اداروں کی طرح سپریم کورٹ کے دونوں فیصلوں میں بھی بالوضاحت افراط زر کی قباحتوں اور اس کے نتائج وعواقب کی سنگینی کا اعتراف کیا گیا ہے اور یہ امر محسوس کیا گیا ہے کہ مسئلے کے منصفانہ حل اور اس کی بابت حتمی فیصلہ صادر کرنے سے قبل ضروری ہے کہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر متخصصانہ دقت نظری سے تحقیق کی جائے۔ اجتماعی اجتہاد کے ان اداروں کے اس فیصلے سے اس غیر علمی رجحان کی حوصلہ شکنی بھی ہوئی کہ مسئلے پر متخصصانہ تحقیق کا

کام ہونے سے قبل ہی کوئی فیصلہ صادر کر دیا جائے بالخصوص ایسے امور میں جن سے امت مسلمہ کے اجتماعی امور اور اس کے ادارے شدید متاثر ہوتے ہوں۔

تاہم یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عدلیہ کا فرض منصبی صرف مسائل کی نشاندہی اور ان کی سنگینی کی طرف توجہ مبذول کرانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ مسائل کا منصفانہ بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ جہاں اس امر کی ضرورت تھی کہ مسئلے کے مناسب حل اور تحقیق پر زور دیا جاتا یہ امر بھی اسی قدر ضروری تھا کہ حتمی حل تک پہنچنے تک کے عرصہ میں افراط زر کے متاثرین کو نقصان اور دوسرے فریق کے استحصال سے بچانے کیلئے کوئی عبوری حل یا متبادل طریقے تجویز کیے جاتے۔

⑥ فیصلہ کن موقف تک پہنچنے کے لیے چند اصولی مباحث

اشیاء کی قیمتوں میں اضافے اور کرنسی کی قدر میں کمی کا رجحان جس تیزی سے بڑھ رہا ہے اس کی سنگینی سے مسلم معیشت دان، علماء اور اجتماعی اجتہاد کے ادارے بخوبی آگاہ ہیں۔ البتہ اس موضوع پر ان کی تحقیقات سے بالعموم یہ تاثر ملتا ہے کہ باوجود یکہ وہ اصولی طور پر افراط زر کی قباحتوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناانصافیوں سے پریشان ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے نظام عدل میں ان برائیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے پیش نظر بعض ایسے اصولی مباحث ہیں جن کا طے ہونا ہنوز باقی ہے۔ یہ مباحث حسب ذیل ہیں

① مثلیت کا مفہوم اور اشاریہ بندی سے اس کا تعلق:

② مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کا جہل وغرر سے تعلق:

③ مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کا شرعی قانون ضمان سے تعلق:

④ اشاریہ بندی کے ناکام تجربات کا اسلامی نظام معیشت سے تعلق:

⑤ اشاریہ بندی اور شبہ ربوا کا تعلق:

⑥ افراط زر اور قومی مصالح کا تعلق:

⑦ اشاریہ بندی اور علت ربوا کا تعلق:

یہی وہ بنیادی مباحث ہیں جن پر مناسب تحقیق نہ ہونے کے باعث ہی اجتماعی اجتہاد کے بیشتر اداروں نے پہلے پہل مؤجل ادائیگیوں میں اشاریہ بندی کے خلاف فیصلہ صادر کیا حالانکہ انہی اداروں نے اپنے فیصلوں میں افراط زر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناانصافیوں اور معاشرتی مسائل کی سنگینی پر بھی اس کے ساتھ ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں ان اصولی مباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مثلیت کا مفہوم اور اشاریہ بندی سے اس کا تعلق

قرض کی ادائیگی میں مثلیت کی رعایت شریعت کی رو سے ضروری ہے اور اس کے وجوب پر فقہاء امت کا اجماع ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہ ''مثلیت'' کا صحیح مفہوم کیا ہے اور کیا اشاریہ کی صورت میں قرض کی ادائیگی جو اصل سرمائے میں ظاہری اضافے اور زیادتی جب کہ معنوی مماثلت کے ساتھ ہوگی اس پر ربوا کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اموال میں ''قیمی'' اور ''مثلی'' کی تقسیم کوئی منصوص شے نہیں ہے جسے شارع نے بطور ضابطہ وقانون مقرر کیا ہو۔ یہ تقسیم دراصل فقہاء امت نے صحتِ معاملات اور عدل وانصاف کے تقاضوں کی موافقت کے پیش نظر کی ہے۔ ابن تیمیہ ''مثل'' کے عوض کے بارے میں کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اس تقسیم میں عدل کی رعایت ضروری ہے جو مصالح دنیا وآخرت کے لیے ضروری ہے اور ارکان شریعت میں سے ایک رکن ہے۔ مالی معاہدوں میں مثل کی رعایت ہی قیام عدل کی ضامن ہے۔ قیام عدل (اس قدر اہم ہے کہ) کی خاطر ہی اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت فرمائی۔'' (61)

یہی وجہ ہے کہ اس تقسیم میں اشیاء کی شکلاً، معنی وقیمۃ یکسانیت وعدم یکسانیت کو معیار ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ مکیلات وموزونات اور ان معدودات کو جو شکلاً ومعناً متقارب ہوں، اموال مثلیہ کا نام دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ دیگر اموال کو قیمی یا مقوم کہا گیا ہے۔

قرآن وسنت میں لفظ ''مثل'' اور اس کے مشتقات کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ موضوع زیر بحث میں استفادہ کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم نے کفار کے انکارِ نبوت محمدی ﷺ کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے آپ کی ظاہری بشری ہیئت وخصائص کی بنیاد پر اپنے اور نبی اکرم ﷺ کو مماثل سمجھا اور یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ ہم میں باہم کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ہم کیوں انہیں اللہ کا پیغمبر اور اس کا مقرب مانیں (62)۔ اس طرح انہوں نے آپ کی نبوت اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کو رد کر دیا۔

قرآن حکیم نے کفار کے اس اشکال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قالت لهم رسلهم إن نحن الا بشر مثلكم ولكن الله يمن على من يشاء من عباده﴾(63)

گویا یہ سمجھایا گیا کہ ظاہری مماثلت ہی بعض اوقات کافی نہیں ہوتی بلکہ کئی دوسرے امور اور باطنی اوصاف ہوتے ہیں جو اشیاء اور افراد کو باہم مغایر بنا دیتے ہیں جیسا کہ مذکورہ صورت میں ظاہر ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو بطور چیلنج پیش کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فاتوا بسورة من مثله﴾ (64)

اس آیت میں لفظ مثل سے بلحاظ اوصاف (یعنی قرآن کے نظم' وضاحت و بلاغت' اخبار غیب اور صداقت کے) مثلیت مراد لی گئی ہے۔ (65)

یہی صورت' حالت احرام میں قتل صید کی جزاء کی مثلیت کے حکم اور (66) زیادتی کے بدلے مماثل زیادتی کرنے کی اجازت (67) کے سلسلے میں بھی نظر آتی ہے۔

فقہاء نے اشیاء میں قیمی اور مثلی کی تقسیم کر کے دونوں کے جدا جدا احکام ذکر کیے ہیں۔ قیمی اور مثلی اشیاء اور ان سے متعلق مسائل پر تفصیلی بحث فقہی ذخائر میں ابواب حج' قروض' بیوع' غصب' جنایات' ضمانات وغیرہ کے ذیل میں بکثرت ملتی ہے۔ خرید وفروخت کے معاملات میں تماثل سے فقہاء یہ مراد لیتے ہیں کہ مماثل اشیاء میں اغراض یعنی وصفِ مرغوب کا تقارب ہو (68)۔ کتب فقہ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ صاحبِ ہدایہ کہتے ہیں:

''دو چیزوں میں مماثلت وہ ہوتی ہے جو صورتاً بھی ہو اور معناً بھی'' (69)

ابنِ عابدین کہتے ہیں:

''مثلی وہ ہے جس کے افراد میں ایسا فرق نہ ہو جو قیمت کے فرق کا موجب ہو''۔(70)

فقہاء نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ مثلی شے کی موجودگی میں مثل ہی لازم ہوگا اور قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا' وجہ یہ ہے کہ مثلیت تب ہی محقق ہوتی ہے جب کوئی شے صورتاً و قیمتاً یکساں ہو۔ اسی بنا پر گھوڑے زمین وغیرہ مثلی نہیں کہلاتے(71) کیونکہ ان کی قدر و قیمت میں بڑا فرق ہوتا ہے اگرچہ ظاہراً وہ ایک جیسے نظر آتے ہیں یا مثلاً زمین وغیرہ۔

ابنِ قدامہ امام غزالی کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مثلی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا اطلاق ہر اس شے پر جو ناپی یا تولی جاتی ہے، ہوتا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ مثلی اس شے کو کہتے ہیں جس میں قیمت اور منفعت کے اعتبار سے بھی مماثلت پائی جائے۔ محض شکل و صورت میں یکسانیت ہی کافی نہیں ہے۔''(72)

ابن قیم بڑے واضح انداز میں اس مسئلہ کی توضیح فرماتے ہیں:

''مثلی کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ جنس' صفت' مالیت اور مقصود انتفاع میں یکسانیت ہو اس لیے جو شے جس قدر ایسی مماثلت کے قریب ہو وہی درحقیقت صحیح مثل ہوگی''(73)

صاحب الدرر السنیۃ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول نقل کیا ہے جو اس سلسلے میں بہت واضح ہے کہ

''قیمتوں میں کمی بیشی مانعِ تماثل ہے۔''(74)

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی قانون' (چاہے وہ سماوی ہو یا وضعی) جو عقل سے متصادم نہ ہونے کا دعویدار ہو' اس میں معنوی مثلیت کی رعایت ضروری ہوگی اور کوئی بھی ایسا نظریہ غیر معقول قرار پائے گا جس کی رو سے دو ظاہراً مماثل اور معناً متفاوت اشیاء ''مثلی'' ٹھہریں۔ چنانچہ فقہ اسلامی اس امر کی شاہد ہے کہ جب کبھی یہ تقسیم اپنے وضعی مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہوئی اور مثلی اشیاء میں اختلاف زمانی یا مکانی کی وجہ سے منفعت اور قدر میں اختلاف واقع ہوا تو ظاہری تماثل کو نظر انداز کر کے قیمت کا اعتبار کیا گیا۔ فقہی ذخیرے میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کے ہاں چوپایوں میں گائے اور بکری کے گوشت میں بھی تفاضل جائز ہے۔ صاحبِ ہدایہ اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

امام ابوحنیفہ کا قول بلحاظ معنی اقوی ہے کیونکہ تفاضل کی حرمت منفعت کی یکسانیت کی صورت میں ہی ثابت ہوگی۔(75)

اسی طرح پانی اگرچہ ایک ''مثلی'' شے ہے۔مگر فقہاء کے بقول اگر ایک آدمی نے اگر صحرا میں کسی کا پانی غصب کرلیا' جہاں پانی کی قدر (Value) بہت زیادہ تھی' بعد میں وہ دونوں اتفاقاً کسی نہر کے کنارے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو غاصب کا پانی ہی کی واپسی پر اصرار کرنا درست نہ ہوگا۔چونکہ پانی کی یہاں وہ قدر و منفعت نہیں رہی جو غصب کے وقت تھی اس لیے اب غاصب پر پانی کے بجائے اس کی قیمت واجب ہوگی۔(76) اسی طرح اگر کوئی شخص شدید گرمی کے موسم میں کسی کی برف ضائع کردے تو سردیوں کے موسم میں اس پر برف کے بجائے قیمت لازم ہوگی کیونکہ اب برف کی وہ قدر و منفعت نہیں رہی جو تلف کرنے کے وقت تھی۔(77)

اسی طرح زیورات اگر ضائع ہو جائیں تو ان کی جگہ ان کا ہم وزن سونا یا چاندی واپس کر دینا کافی نہ ہوگا بلکہ اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی (78)۔نیز مختلف ممالک کی کرنسیوں کے باہمی تبادلے میں فقہاء نے تفاضل کو جائز کہا ہے۔ چونکہ کرنسی' قوت خرید کے ایک مخصوص معیار سے عبارت ہے اور ہر ملک کے ہاں کرنسی کا الگ الگ معیار ہے اس لیے مختلف ممالک کی کرنسیوں کو باہم مختلف الاجناس کہا گیا ہے۔مجمع الفقہ الاسلامی مکہ کی مجلس نے مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کو مختلف اجناس قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

> ''مختلف ممالک کی کاغذی کرنسی' محل اجراء کے مختلف ہونے کی بنا پر الگ الگ جنس سمجھی جائے گی۔گویا سعودی کرنسی اور امریکی کرنسی الگ الگ جنس ہوگی جن کی آپس میں بیع مطلقاً جائز ہوگی کیونکہ یہ غیر جنس کے ساتھ بیع ہوگی اور اس میں محض نام کی یکسانیت حقیقت کے مختلف ہوتے ہوئے نا قابل لحاظ ہوگی۔'' (79)

امام ابو یوسف کے نزدیک ادائیگی کے وقت اگر فلوس کی قیمت بدل جائے تو قیمت کا اعتبار کیا جائے گا(80) (اس مسئلہ کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔)

یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ بیشتر فقہاء نے مثلیات کو صرف ان اشیاء میں منحصر سمجھا ہے جو ناپی یا تولی جاتی ہیں اور باقی معدودات یعنی جن اشیاء کا تبادلہ گنتی کر کے کیا جاتا ہے ان کو مثلیات میں شمار نہیں کیا۔یہ ایک عالم گیر

قانون ہے کہ مبادلے کے وقت تعداد کے بجائے اشیاء کی حقیقی قدر ہی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ عدد' کیل ووزن کی طرح کا ایک معیار ہے جس کا مقصد بعض اشیاء کی تعیین مثلیت کو آسان بنانا ہے۔ نیز عدد کو صرف وہیں قابل لحاظ سمجھا جاتا ہے جہاں اشیاء کی حقیقی قدر میں یکسانیت ہو۔ کہیں بھی عملی مبادلات میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں کہ دو غیر مساوی قدر کی اشیاء میں عدد کا لحاظ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ دو مختلف ممالک کی کرنسیاں اگر چہ وہ ہم نام اور ہم شکل ہی ہوں ان کے تبادلے میں عددی مثلیت نہیں دیکھی جاتی' اس لیے کہ ان میں معنوی مماثلت مفقود ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے جن فقہاء نے مثلیت کی اقسام میں معدودات کو شامل کر لیا ہے انہوں نے اس کے لیے حقیقی قدر کی یکسانیت کی شرط بھی عائد کی ہے۔ حنفیہ' مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ وغیرہ سب ہی کا مسلک ہے کہ دراہم ودنانیر صرف اسی وقت تک معدودات شمار ہوں گے جب ان میں باہمی وزنی مماثلت ہوگی۔ اگر ان کے وزن میں باہم فرق ہے تو باوجود عددی مثلیت کے فقہاء انہیں مثلی نہیں گردانتے۔

شرح مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے:

''یعنی فلوس جب رائج ہوں تو وہ مثلی اور ثمن شمار ہوں گے اور جب وہ رائج نہ رہیں تو قیمی اور سامان "commodity" شمار ہوں گے۔'' (81)

اس بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ کاغذی نوٹ دست بدست لین دین میں تو مثلی ہی قرار پائیں گے مگر وقت گذرنے کے ساتھ جب ان کی قدر میں واضح تغیرات واقع ہو جائیں تو ان کی حیثیت بدل کر ''قیمی'' ہو جائے گی۔ یا فقہی الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں کاغذی کرنسی کا مثلی سے قیمی میں ''تحول'' ہو جائے گا۔

مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کا جہل وغرر سے تعلق

فقہاء کے ہاں یہ امر مسلم ہے کہ قرض کی ادائیگی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور برابری شرط ہے۔ محض اندازے اور تخمینے پر مبنی معاملہ شرعاً درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بیع مزابنہ (82) کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں بیع (درخت پر لگی کھجور) کی مقدار صرف اندازہ وتخمین ہی سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے سے ادائیگی میں تخمینی مثلیت کا اعتبار اور جہل وغرر کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ درست ہے کہ یقینی مشیت کی موجودگی میں تخمینی مشیت کو اختیار کرنا شرعاً قابلِ قبول نہیں ہے مگر اس کا قطعاً یہ تقاضا نہیں کہ یقینی مشیت کی عدم موجودگی میں تخمینی مشیت کو بھی چھوڑ دیا جائے اور اہل حقوق کے حق کی صحیح تعیین و تشخیص ممکن نہ ہونے پر انہیں ان کے حق سے ہی محروم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرضوں کی اشاریہ بندی نہ کرنے کی صورت میں مشیت کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہتی نہ اس پر یقینی مشیت کا اطلاق ممکن ہے نہ تخمینی مشیت کا۔ اس کے برعکس اشاریہ بندی کی صورت میں کم از کم تخمینی مشیت ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اب گویا دو صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ ایک طرف یقینی تفاوت ہے (Definite Difference) اور دوسری طرف تخمینی مشیت۔ ایسی صورت میں ایفاء حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ''اھون البلیتین ''یعنی تخمینی مشیت کو اختیار کرنا ضروری ہو جائے گا۔

مالی معاملات میں فقہاء نے ''جہل وغرر'' کی ممانعت بالاتفاق اس بنا پر کی ہے کہ فریقین کو ہر طرح کے نقصان سے بچایا جائے اور ان کے مابین کسی قسم کے بھی متوقع نزاع کا سدِ باب کیا جائے(83) مگر ایسے لاتعداد فقہی نظائر موجود ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسے امور جن میں تقدیر (Estimation) وتعیین ممکن نہ ہو وہاں حقوق وادائیگیاں ساقط نہیں ہو جاتیں۔ یعنی عدم تعیین کسی کو اس کے حقوق سے محروم نہیں کر سکتی۔(84)

حق بات یہ ہے کہ اشاریہ بندی سے جہل وغرر کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس نزاع کا احتمال ختم ہو جاتا ہے جو اشاریہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں دائن، اور مدیون دونوں کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دین اسی قدر یعنی اپنے اسی وصف اور کیفیت میں واپس ہوگا جس قدر وہ لیا گیا تھا۔ جب کہ اشاریہ بندی نہ ہونے کی صورت میں فریقین اس بات سے قطعاً لاعلم ہوتے ہیں کہ ادائیگی کے وقت آیا کرنسی نوٹ اسی قدر کے حامل ہوں گے جو بوقت عقد تھی یا محض کاغذ کے بے قیمت ٹکڑوں کی شکل میں ادائیگی ہوگی۔

مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کا شرعی قانون ضمان سے تعلق

شریعت نے ازالہ ضرر کے لیے کچھ اصول وضوابط مقرر کیے ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ نقصان کی تلافی اس وقت ممکن ہے جب یہ متعین ہو جائے کہ نقصان کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ کرنسی کی قیمت میں کمی کے عوامل بہت سارے ہیں جن میں بعض عوامل محض فطری ہیں جن کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ پھر اس امر کی

تعیین بھی مشکل ہے کہ کون کتنا ذمہ دار ہے۔اس لیے جب تک ذمہ داری کا تعین نہیں ہوتا تب تک کسی کو اس نقصان کی تلافی کرنے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔قرآنی اصل ﴿لا تزر و ازرۃ وزر اخری﴾(85) اس کی مؤید ہے۔اس پس منظر میں کیا مقروض کو اس امر کا پابند کیا جا سکتا کہ وہ روپے میں واقع ہونے والی اس کمی کا ازالہ کرے جس کا باعث وہ نہیں بنا۔

دراصل اشاریہ بندی کا اسلام کے قانون تاوان سے کچھ تعارض نہیں ہے۔اور نہ ہی اس کا نقصان کی تلافی کے مسئلے سے کوئی منطقی ربط ہے۔اس سکیم کو پیش کرنے کا اصلاً ہدف ہی یہ ہے کہ ہر دو فریق نقصان سے محفوظ رہ سکیں اس لیے جب اس کی موجودگی میں کسی فریق کے حق میں نقصان کا وقوع ہی نہ ہوگا تو تاوان کی بحث بھی بے معنی ہوگی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ دیون کی مؤجل ادائیگی میں روپے کی قدر کی کمی (Devaluation) کی تلافی مقروض کے بجائے قرض خواہ کے ذمہ کرنا گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ قدر کی کمی کا ذمہ دار صرف قرض خواہ ہے اس لیے اس کی تلافی بھی وہی کرے گا۔ اس کے برعکس اگر مقروض پر مثل حقیقی کی شکل میں قرض کی ادائیگی کو لازم کیا جائے تو عدل کے تقاضے پورے ہوسکیں گے کسی بھی فریق کا نقصان نہ ہوگا اور روپے کی قدر میں کمی کی ذمہ داری کسی غیر ذمہ دار فرد پر عائد نہ ہوگی۔

اس مقام پر یہ بات بھی محل نظر ہے کہ فقہاء کے ہاں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ کرنسی کے کساد کی صورت میں جب کہ حاکم وقت فلوس کی نقدیت (زری حیثیت) کو ختم کردے تو مقروض پر انہی فلوس کو واپس کرنے کے بجائے قیمت کی ادائیگی لازم ہوگی حالانکہ اس صورت میں بھی مقروض اس نقصان کا قطعاً ذمہ دار نہیں ہے۔ فقہاء نے محض اس بنا پر کہ وقوع عیب چونکہ مقروض کے قبضے میں واقع ہوا ہے اس کو اس کمی کے ازالے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ ان فلوس کی قیمت ادا کرے۔(86)

اب کرنسی کی قدر میں کمی بیشی والی صورت کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی صورت حال ایسی ہی ہے بلکہ رخص و غلا کی حالت اور کساد کی حالت کا فرق یہ ہے کہ رخص وغلا میں بالعموم تسلسل اور تدریج کا پہلو ہوتا ہے اور مقروض قرض لے کر اسے اپنی ضرورت میں استعمال کر لیتا ہے۔ایسا نہیں ہوتا کہ قرض لے کر وہ اسے رکھ لے اور اس کی مالیت روز بروز کم ہوتی رہے۔اس صورت میں تو مقروض قرض کی وصولی کے وقت کی مالیت سے پوری طرح مستفید ہو جاتا ہے

اب اس پر اس میں کون سا ظلم کا پہلو ہے کہ وہ وہی مالیت مقروض کو لوٹا دے جو اس سے وصول کی تھی جبکہ کساد کی حالت میں رخص وغلاء کی طرح تدریج اور تسلسل نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ ادھر مقروض نے قرض لیا ادھر کرنسی کساد کا شکار ہوگئی۔ حالانکہ یہی روپیہ اگر قرض خواہ کے پاس ہوتا تب بھی یہی ہونا تھا۔

اشاریہ بندی کے ناکام تجربات کا اسلامی نظام معیشت سے تعلق

چند ممالک جنہوں نے اپنے ہاں اشاریہ سکیم کو متعارف کروایا ان کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اشاریہ کے نظام میں فوائد کی نسبت نقصانات کا پہلو وزنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سکیم اب تک صرف چند ملکوں میں رائج ہوسکی ہے اور وہاں بھی اس کا اطلاق صرف خاص شعبوں میں ہی کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس تجربے کی روشنی میں یہ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ نظریہ ایک عام اصول کے طور پر نہیں اپنایا جاسکتا۔(87)

مؤجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کے تجربے کی ناکامی کی مثالیں دراصل غیر اسلامی اور سرمایہ دارانہ سودی نظامِ معیشت سے مستعار اور انہی کے ساتھ مختص ہیں۔ ایک اسلامی نظام معیشت کے ساتھ یہ تجربات کچھ مطابقت نہیں رکھتے۔ سودی نظام میں موجل ادائیگیوں کے معاملات تقریباً متاثر نہیں ہوتے' اس لیے کہ قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زر کی جو قدر گرتی ہے اس کا ازالہ وہاں شرح سود میں اضافے سے کرلیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چین میں 1947ء میں' جب افراط زر چھ سو فیصد ۶۰۰٪ سالانہ تھا' تب بنک ڈیپازٹس پر سود کی شرح دو فیصد روزانہ تھی جو ہر روز مرکب (Compound) ہوتی تھی۔ اسی طرح جنوبی کوریا کی مثال بھی اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے کہ جہاں کورین جنگ (Korian War) کے فوراً بعد جب افراط زر چالیس ۴۰٪ فیصد سے سو ۱۰۰٪ فیصد سالانہ تک پہنچ گیا تو شرح سود پانچ ۵٪ فیصد ماہانہ ہوگئی۔(88) غرض ایسے ممالک میں جہاں خاص طور پر سودی نظام کا چلن رائج ہے وہاں یہ چیز ایک سائنسی فارمولے کے طور پر مسلم ہے کہ جب اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوگا' اس کے ساتھ ہی شرح سود میں بھی اضافہ ہوجائے گا' اور جب قیمتوں میں کمی واقع ہوگی تو یہ شرح بھی خود ہی کم ہوجائے گی۔ قیمتوں اور شرح سود کے اس تعلق کو (Gibson Paradox) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہاں قدر زر ہر صورت میں محفوظ رہتی ہے۔

گویا سودی نظام' اشاریہ بندی کے متبادل ایک نظام ہے جس میں وہ کمی' جو اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زر کو لاحق ہوتی ہے' اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ شدید افراط زر کے حالات میں اس کے ناخوش گوار اثرات کے ازالے کے لیے سود کی شرح میں اضافہ کر دینا زیادہ بہتر' سادہ اور آسان علاج ہے بنسبت اس کے کہ اشاریہ بندی کا قدرے پیچیدہ نظام اختیار کیا جائے۔ بنابریں سودی نظام والے ممالک میں اشاریہ بندی کی سکیم پر کم توجہ دینا ایک فطری امر ہے۔ لہذا اس سلسلے میں ان کے تجربات کی مثالیں ایک غیر سودی نظام معیشت کے لیے بر محل نہیں ہیں جہاں افراط زر کے مفاسد کہیں زیادہ شدید اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

اس تمام صورت حال' اور سودی نظام کے رواج کے باوجود' (جس میں زر کی حقیقی قدر کی بڑی حد تک تأمین (Portection) ہو جاتی ہے) مغربی ماہرین معیشت افراطِ زر کو ایک سنگین مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے مفاسد سے بچاؤ پر مسلسل تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں اس موضوع پر اس قدر تصنیفات موجود ہیں جن کا شمار بہت مشکل ہے۔ اس تناظر میں ایک مسلم معاشرے اور مسلم معیشت میں یہ مسئلہ زیادہ لائق توجہ ہونا چاہیے جہاں افراطِ زر کے مفاسد سے بچاؤ کے لیے سود کا متبادل نظام قابلِ قبول نہیں ہے۔

اشاریہ بندی اور شبۂ ربوا کا تعلق

شریعتِ اسلامیہ میں بڑی شدت سے ربا کی ممانعت کی گئی ہے۔ قرآن وسنت کی نصوص اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ اس برائی کی بیخ کنی کا اسلام میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ ان امور سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے جن میں ربا کا محض شک ہو۔(89) اس پس منظر میں کیا قرضوں اور دیگر مؤجل ادائیگیوں کے اشاریے کی صورت میں ربا کا شبہ واقع ہو جاتا ہے؟ اور کیا حضرت عمر فاروق کے اس حکم ((فدعوا الربوا والريبة)) کی رو سے اس سے بچنا ضروری ہے؟

شک سے بچنے کا جہاں تک تعلق ہے' اس کی رعایت نہ صرف معاملاتِ ربا میں ضروری ہے بلکہ شریعت کا موقف یہ ہے کہ ایسے تمام امور جن میں حرام کا شبہ ہو ان سے بھی اجتناب لازم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ نقطۂ نظر بھی اشاریہ ہی کی ضرورت اور مشروعیت کو ثابت کرتا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ جب مشتبہات تک سے بچنے کی تاکید ہے تو خود محرمات سے اجتناب کس قدر ضروری ہوگا۔ کیونکہ مشتبہات سے ممانعت سدِ ذریعہ کے طور پر ہوتی ہے جس

کا اصل سبب انسان کو محرمات میں پڑنے سے بچانا ہے۔ اس کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ محرمات کا ارتکاب تو بیشک کر لیا جائے مگر مشتبہات سے ضرور بچا جائے۔ فرمان نبوی: ((دع ماير يبك الى ما لا يريبك))(90) میں ''ریب'' سے ''لاریب'' کی طرف ارتقا کا حکم ہے۔ نیز فقہی اصل ((اليقين لا يزول بالشك)) (91) کی بنا پر فقہاء امت کا اتفاق ہے کہ شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا (92) یعنی یقین سے شک کی طرف تنزل روا نہیں ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشاریہ کی سکیم میں ربا کا شبہ ہے تو یہ بات لاریب ثابت ہے کہ اس سکیم کے ترک میں اہلِ حقوق کی حق تلفی اور ظلم کا یقین ہے اور ظلم وحق تلفی کی حرمت قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس لیے شرعاً اس امر کی اجازت نہیں کہ گناہ کے شبہ سے بچنے کے لیے (اگر بالفرض ایسا شبہ ہو) قطعی حرام کا ارتکاب کر لیا جائے۔

افراطِ زر اور قومی مصالح کا تعلق

بعض اہل علم جو افراطِ زر کی افادیت کے قائل ہوئے ہیں' کے خیال میں حکومت جب افراطِ زر پیدا کرتی ہے تو اس کے پیش نظر پوری قوم کی بہبود' روزگار کے مواقع میں اضافہ اور ملک کی ہنگامی ضروریات کی تکمیل وغیرہ جیسے اہم امور ہوتے ہیں۔ اس سے ملکی آزادی کے تحفظ کے لیے دفاعی اخراجات کے سلسلے میں بھی خاصی مدد ملتی ہے۔ گویا اس طرح چھوٹے اور انفرادی نقصان کے بدلے بڑا اور اجتماعی فائدہ میسر آتا ہے۔ یہ حضرات اپنے موقف کے اثبات کے لیے چند فقہی قواعد پیش کرتے ہیں مثلاً:

((الضرر الاشد يزال بالا خف))(93) ''شدید ضرر کا ازالہ نسبتاً خفیف ضرر سے کیا جائے گا''۔

نیز ((يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام)) (94) ''ضرر عام کے ازالہ کے لیے ضرر خاص کو برداشت کیا جائے گا''۔

ان اصولوں کی روشنی میں وہ یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ چونکہ اشاریہ بندی کی وجہ سے حکومت کو اپنے اخراجات بسہولت پورا کرنے میں مشکل پیش آئے گی اور اجتماعی منصوبوں کی تکمیل متاثر ہوگی' اس لیے اشاریہ کی سکیم اپنانا درست نہیں ہے مبادا مصالح قومی پر کوئی زد پڑے۔

افراطِ زر کے حق میں جو یہ موقف اختیار کیا گیا ہے اس کی صحت کا مدار افراطِ زر پیدا کرنے کے جواز پر ہے۔ اسلام کی کرنسی پالیسی (Fiscal Policy) میں اس چیز کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ حکومت کو افراطِ زر پیدا کرنے

کے لامحدود اختیار دے دیے جائیں۔ اسلام قدرِ زر میں ثبات کی تاکید کرتا ہے اور ایسے اسباب وعوامل سے سختی سے منع کرتا ہے جو لوگوں کے اموال میں کمی کا باعث بنیں۔ چنانچہ اس فعل کو ((سرقہ))، ((فساد فی الارض))، "بخس"، "تظفیف" اور "اکل اموال الناس بالباطل" پر محمول کیا گیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام نے حکومت کو مصالح قوی کے لیئے حسبِ ضرورت عوام سے ٹیکس لینے کا اختیار دیا ہے مگر اس کے لیئے کچھ اصول وضوابط ہیں۔ مثلاً اسلام کی رو سے درست طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس لوگوں سے براہ راست وصول کیا جائے نہ یہ کہ اس کے لیے کوئی چور دروازہ اختیار کیا جائے کیوں کہ اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ ہر طرح کے معاملات میں صفائی اور درستی کی تعلیم دیتا ہے اور کسی بھی ابہام واخفا کا روادار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اقتصادیات کے میدان میں جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ افراطِ زر کی شرح جس قدر کم ہوگی ملکی اقتصادی صورتِ حال اسی قدر بہتر ہوگی۔ اس طرح افراطِ زر کا قوی مصالح کے ساتھ ربط کا نظریہ جدید تحقیقات کی رو سے غلط ثابت ہو گیا ہے۔

اشاریہ بندی اور علت ربوا کا تعلق

آیت قرآنی ہے کہ:

﴿فان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون﴾ (95)

اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر مؤجل ادائیگیاں اشاریہ بندی کے بغیر ہوں گی تو اس سے قرض خواہ کی حق تلفی ہوگی اور اس پر ظلم ہوگا کیوں کہ اس کی دی ہوئی رقم کی قوتِ خرید اب پہلے کی نسبت بہت کم ہو چکی ہے اس موقف کے برخلاف بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ "ظلم" ربا کی علت نہیں بلکہ یہ اس کی "حکمت" ہے جب کہ احکام کا دارومدار علتوں پر ہوتا ہے نہ کہ حکمتوں پر۔ حکمت اگرچہ شرعی احکام کی روح اور بنیاد ہوتی ہے مگر وہ مخفی اور غیر معین ہونے کی بنا پر مدارِ احکام نہیں بن سکتی۔

اس سلسلے میں فقہی آراء کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے تعلیلِ احکام کی دو صورتیں بیان کی ہیں

① تعلیل میں ایسا انضباط ہو جو حکمت کو شامل ہو۔

② تعلیل محض حکمت کے ساتھ ہو۔

پہلی قسم کی تعلیل کے جواز میں فقہاء کے ہاں کوئی اختلاف نہیں ہے(96) البتہ دوسری صورت کے بارے میں تین آراء ہیں پہلی رائے یہ ہے کہ حکم کی تعلیل حکمتِ مجردہ کے ساتھ (جس میں انضباط نہ ہو) جائز نہیں ہے۔(97) دوسری رائے جواز کی ہے(98) تیسری رائے یہ ہے کہ حکمت کی نوعیت دیکھی جائے گی۔ اگر حکمت بذات خود ظاہر اور منضبط ہو تب تو اسی سے تعلیل ہوگی اور اگر حکمت مخفی ہو تو ایسی صورت میں اس سے تعلیل درست نہ ہوگی(99) آمدی نے اس رائے کو مختار کہا ہے(100)۔

گویا یہ امر مسلم ہے کہ اگر کسی حکمِ شرعی کی حکمتوں میں ظہور و انضباط پایا جائے تو ایسی صورت میں تعلیل بالحکمت ہی ضروری ہوگی کیونکہ احکام کی تشریع میں شارع کا مقصود یہی ہوتا ہے۔ تاہم اگر حکمت میں خفا اور عدمِ انضباط ہو تو ایسی صورت میں کسی ایسے امرِ ظاہر و منضبط کو اس کا قائم مقام کر دیا جاتا ہے جو اس حکمت کا مظنہ ہوتا کہ حکم کو اس پر دائر کرنے کی صورت میں حکمتِ مقصودہ کے تحقق کا گمانِ غالب حاصل ہو جائے۔ چنانچہ حکمت پر مبنی حکم کی ایسی علت مستنبط کی جاتی ہے جو اپنی حکمت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہو۔ غرض علل کو ایک انتظامی ضرورت کی بنا پر وضع کیا گیا ہے جن کی حیثیت ایک وسیلہ کی ہے اور ان کا کام یہ ہے کہ وہ حکم کی ان تمام مصالح و حکمتوں کا تحفظ اور ان کی عمل داری کرائیں جو ظہور و انضباط کے دائرے میں آسکیں۔

اس اصولی بحث سے دو نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی زمانے میں کسی مسئلے میں حکمت یا اس کے کسی ایک پہلو کو ظہور و انضباط کی شکل نہ دی جا سکتی ہو مگر بعد کے دور میں اسی مسئلے میں ظہور و انضباط واقع ہو جائے تو دوبارہ حکمت کی طرف رجوع کریں گے۔ فقہِ اسلامی میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر علت مظنۂ مصلحت نہ رہے تو حکمت کی طرف رجوع کرتے ہوئے دوبارہ تعلیل کی جائے گی۔ چونکہ علل وسائل ہیں اور اصول ہے کہ ((لا عبرة بالوسائل اذا لم تتحقق المقاصد)) یعنی اگر احکام کے وسائل (علل وغیرہ) سے حکم کا مقصد (حکمت) حاصل نہ ہو تو وسائل کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات سے بخوبی راہنمائی مل سکتی ہے۔(101)

اس پس منظر کے ساتھ ہم اپنے موضوع زیر بحث کی طرف آتے ہیں۔ اگر اس سارے مسئلے کا اختصار کیا جائے تو حسب ذیل صورت سامنے آتی ہے۔

① علت ربا منصوص نہیں ہے۔ یہ مجتہد فیہ ہے اور اس کی تعیین میں فقہاء کے مابین خاصا اختلاف ہے۔ جب کہ حکمت ربا منصوص ہے یعنی ظلم، جس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ اس لیے منصوص حکمت کی رعایت اور اس کی مناسبت علت میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

② معدودات کو مثلیات میں شمار کرنے اور نہ کرنے میں بھی فقہاء کی دو رائے ہیں۔

③ مثلی کا کیا مفہوم ہے؟ یہ ایک خالص عقلی اور فقہی بحث ہے۔ شریعت نے بطور نص اس کی تعیین نہیں کی۔ چنانچہ اس کے مفہوم کی تعیین میں بھی دو آرا ہیں۔

④ علت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ حکمت سے مناسبت رکھتی ہو۔

⑤ حرمتِ ربا کی حکمت ظلم ہے۔

ان مبادیات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ فقہ حنفی میں بتائی گئی علت ربا میں "مثلیت" کی تعبیر یہ ہے کہ اس سے مراد حقیقی مثلیت ہے۔ باقی جن علمائے فقہ نے مثلیت کے مفہوم کی عدد کے ساتھ تحدید کی تھی ان کی رائے بھی اپنے احوال وظروف کے لحاظ سے درست تھی اس لیے کہ اس وقت عدد کی مثلیت بالعموم حقیقی مثلیت ہی کی مظہر اور اس کی انضباطی صورت ہوتی تھی۔ جب کہ آج صورتِ حال یقیناً ایسی نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ربا کی علت مجتہد فیہ ہے۔ کئی چیزیں جو کچھ فقہاء کے ہاں ربا نہیں دوسرے انہیں ربا کہتے ہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ علتِ ربا کا مسئلہ خالصتاً ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ ہے جس کا تعلق نص کے بجائے تحقیق اور تعلیل سے ہے۔

نتیجۂ بحث

کسی بھی معاشی نظام میں زر ایک ایسی شے ہے جو لوگوں کے معاشی معاملات کو منضبط کرتی ہے۔ بائع و مشتری، آجر و اجیر اور کئی دیگر فریقین معاہدہ کے باہمی تعلق کا مدار اسی پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر شریعت کی رو سے یہ لازم ہے کہ معاملات میں صحت اور عدل کو قائم رکھنے اور ظلم ونزاع کے عوامل کو دور رکھنے کے لیے اشیاء کی قیمت کا مقیاس اور معیار (زر) ایسا ہو جس میں ثبات وقرار ہو یعنی وہ معقول حد تک مستحکم مالیت کا حامل ہو (102)۔

قرآنِ حکیم میں اس امر کی ممانعت کی گئی ہے کہ نقود میں کھوٹ ملائی جائے کیونکہ یہ عمل سنگین مسائل اور مضرتوں کا موجب بنتا ہے(103)۔

قرآنی آیت:

''لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔''(104)

اور:

''اے قوم! ماپ تول کو پورا کرو اور لوگوں کی اشیاء میں کمی نہ کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔''(105)

میں قوم شعیب کے مذکور واقعہ کے بارے میں مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں بخس سے مراد دراہم و دنانیر میں کمی ان کی قطع اور ان میں کھوٹ ملانا ہے جس کی قوم شعیب مرتکب تھی(106)

اس سے معلوم ہوا کہ سکہ میں قطع و برید اور ''بخس'' (جو عصرِ حاضر میں بصورت افراطِ زر پایا جاتا ہے) حاکم و رعیت دونوں کے لیے ناروا ہے کیونکہ یہ لوگوں کے لیے موجب ضرر ہے۔ نیز یہ ((اکل اموال الناس بالباطل)) کی ایک صریح شکل ہونے کی بنا پر ایک ظالمانہ اقدام ہے۔

مسئلہ افراطِ زر کا حقیقی اور اہم ترین حل تو یہی ہے کہ قدرِ زر کے تحفظ کو یقینی بنانے کے سلسلے ٹھوس اقدامات کیے جائیں جو اصولی طور پر ایک حکومتی ذمہ داری ہے۔ تاہم افراطِ زر کے ناگزیر حالات میں اس کے اثراتِ بد سے بچاؤ اور دائن و مدیون کو ضرر سے بچانے کے سلسلے میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں' یہ علمی حلقوں اور اجتہادی اداروں کے کرنے کا کام ہے۔ جن امور پر بطورِ خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

① قدرِ زر کے تحفظ کے شرعاً قابلِ قبول طریقے معلوم کرنا۔

② افراطِ زر کے اثرات سے بچاؤ کی شرعی تدابیر تلاش کرنا۔

③ تغیرِ فاحش کی حد بندی و انضباط۔

مختلف علمی حلقوں اور اجتہادی اداروں کے رجحان کے مطابق کاغذی زر کی مثلی حیثیت ختم ہو رہی ہے اور اسے قیمی قرار دیا جا رہا ہے۔ تنخواہوں اور مہرِ مؤجل کی حد تک تو یہ امر خاصی حد تک طے پا چکا ہے بلکہ دیگر قرضوں سے

متعلق بھی یہی صورت حال دیکھنے میں آرہی ہے۔ تاہم اس نظریے کو عملی صورت دینے کی مناسب صورت کیا ہوگی' یہ معاملہ طے ہونا ابھی باقی ہے۔ تحقیقی اور اجتہادی اداروں کے لئے اہم کام یہ ہے کہ تمام مجوزہ صورتوں اور انکے مضمرات وعواقب پر ماہرین سے ٹھوس تحقیق کروائی جائے اور مسئلے کا ایسا حل تلاش کیا جائے جو قرآن کے فلسفہ ربوا ﴿لا تظلِمون ولا تظلمون﴾ کی عملی تصویر ہو۔

بحث کے اختتام پر مقالہ میں ذکر کردہ شرعی اصول وقواعد' فقہی مؤیدات اور اجتہادی اداروں کی سفارشات کے پیشِ نظر یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ عصرِ حاضر کے زرِاعتباری کو بجائے ظاہری قدر (Face Value) کے' قوتِ خرید کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ نیز اسے عام احوال میں تو مثلی سمجھا جائے مگر جب اس کی قدر میں تغیرِ فاحش واقع ہو جائے تو اسے قیمی قرار دیا جائے' اس لیے کہ اموال میں حقیقی مثلیت تب ہی متحقق ہو سکتی ہے جب وہ باعتبار قیمت بھی باہم مماثل ہوں۔ تغیر' بالخصوص تغیرِ فاحش' کے بعد زرِاعتباری کی عددی حیثیت میں چونکہ تقارب ختم ہو جاتا ہے' اس لیے اس کی مثلیت برقرار نہیں رہتی' کیوں کہ یہ امر مسلم ہے کہ فقہاء کے ہاں جن حضرات نے معدودات کو مثلیات میں شمار کیا ہے انہوں نے بھی معدودات میں تقارب کی شرط عائد کی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(1) یعنی اگر آج قدر زر میں کچھ کمی ہوئی ہے تو کل صورت اس کے برعکس ہوگی۔ اس طرح نہیں کہ قدر مسلسل ہی گرتی رہے اور بڑھنے کی نوبت نہ آئے۔

(2) بلاذری، ابوالحسین: فتوح البلدان، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1398، ص452

(3) اس باب میں اہم معلومات کی تفصیل حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل کتب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ المعیار المعرب والجامع المغرب، امام أحمد بن یحی الونشریشی، دارالغرب الإسلامی، بیروت

ب۔ الحاوی للفتاوی، سیوطی، دارالفکر، بیروت

ج۔ أنباء الغمر بأبناء العمر، شیخ الإسلام أحمد ابن حجر العسقلانی، مجلس دائرہ المعارف العثمانیہ 1378، الھند

د۔ النقد والإئتمان فی البلاد العربیۃ، دکتور عصام یوسف عاشور، 1992 مصر

(4) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز: حاشیہ ابن عابدین، 3:132-133

(5) ابن عابدین، تنبیہ الرقود، 59:

(6) شرح فتح القدیر، 5:382

(7) ابن عابدین، حاشیہ ابن عابدین، 5:163

(8) ایضا، 4:24

(9) النووی، محی الدین: المجموع، المکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ، د۔ت، 6:289

(10) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

ابن ہمام، فتح القدیر، مطبعہ مصطفیٰ محمد، قاہرہ، د۔ت، ج7، ص:4

ابن رشد، بدایۃ المجتہد: دارقہرمان للنشر والتوزیع، استنبول، 1985، ج1 ص:130

النووی، مجموع نووی: المکتبہ السلفیہ، المدینہ المنورہ، د۔ت، ج9، ص:395

ابن قدامہ، المغنی، دارالکتاب العربی، بیروت، 1392ھ، ج4، ص:75

(11) الشافعی، محمد بن ادریس: الام، کتاب الشعب، القاہرہ، د۔ت، ج3، ص98

(12) ابن عابدین، مجموعہ رسائل ابن عابدین، 2:64

(13) تھانوی، اشرف علی: امداد الفتاوی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، 1385ھ، ص:5

(14) تکملہ فتح الملہم ج1، ص:519

(15) Encyclopeadia Britannica, 15h ed, P.335, University of Chicago, 1987.

(16) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

تھانوی، اشرف علی: امداد الفتاوی، 5:2

گنگوھی، رشید احمد، مفتی: فتاوی رشیدیہ، 356

الحلاوی، محمد بن عبدالرحمان مصری: بھجۃ المشتاق لاحکام الطلاق، 1314ھ، ص68

(17) عبدالرحمٰن بن سعدی: فتاوی السعدیہ، الطبعۃ الثانیہ، الریاض، 1984م، 318-329

سعید احمد، مفتی: نوٹ کی شرعی حیثیت، 20-29

(18) ابن المنیع، عبداللہ بن سلیمان: الورق النقدی: حقیقتہ التاریخیۃ، قیمتہ وحکمہ، الطبعۃ الثانیۃ، الریاض، 1403ھ، ص96

ابن تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام: مجموع الفتاوی، ریاض، ۱۳۹۸ھ، ص224، 295

(19) ابن المنیع، الورق النقدی، 83

(20) السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن: قطع المجادلہ عند تغیر المعاملہ ضمن کتاب "الحاوی للفتاوی فی الفقہ وعلوم التفسیر والحدیث و الاصول والنحو والاعراب وسائر الفنون" مکتبہ التجاریۃ الکبری، قاہرہ، ط3، 1959م، 1:97

علیش، ابوعبداللہ محمد بن احمد: منح الجلیل علی خلیل، المطبعۃ الکبری، 1294ھ، 2:534

(21) زیلعی، فخرالدین عثمان بن علی: تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، المطبعۃ الامیریہ، بولاق، 1314ھ، 4:143

(22) البدائع 7:3244

(23) عالم گیر اورنگ زیب، ابوالمظفر محی الدین: فتاوی عالمگیری، ادارہ نشریات اسلام، لاہور، 3:225

کاسانی، علاءالدین ابوبکر بن مسعود: بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مطبعہ الجمالیہ، القاہرہ، ط1، 1328ھ، 7:3244 ومابعد

زیلعی، تبیین الحقائق، 4:142

حیدر علی: درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام، مکتبۃ النھضۃ، بیروت، 3:94

(24) ابن عابدین، حسبیہ الرقود، 2:61

(25) زیلعی، تبیین الحقائق، 4:142

عالم گیر، فتاوی عالمگیری 3:225

حیدر علی، درر الحکام، 3:941

(26) بھوتی، منصور بن یونس بن صلاح الدین: شرح منتھی الارادات، المکتبۃ العلمیہ، بیروت، 226:2
دردیر، ابوالبرکات أحمد بن محمد: الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی، مطبعۃ البابی الحلبی، مصر، د۔ت، 358:4

(27) رھونی، محمد بن احمد: حاشیۃ المدنی علی کنون، المطبعۃ الأمیریۃ، بولاق، 1306ھ، 118:5

(28) ابن قدامہ، المغنی، 365:4

(29) بعض حنابلہ بھی اسی قول کے قائل ہیں۔

(30) حیدر علی، درر الحکام، 94:3

(31) المرغینانی، برہان الدین علی بن ابی بکر: الھدایۃ مع فتح القدیر، 154:7

(32) زیلعی، تبیین الحقائق، 143:4

اسی طرح شرح مجلہ لعلی حیدر میں ہے کہ: "الانقطاع: هو عدم وجود مثل الشيئ في الأسواق، ولو وجد ذلك المثلي البيوت، فانه مالم يوجد في الاسواق، فيعد منقطعاً (دررالحکام، ۱۰۸:۱)

(انقطاع، بازار میں عدم وجود مثل کا نام ہے۔ اگرچہ گھروں میں مثل موجود ہو۔) خرشی اور زرقانی نے انقطاع کے بارے میں یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ:

ان العبرة بالعدم في بلد المعاملة ، أي البلد التي تعاملا فيها و لو وجد في غيرها فانه يعتبر منقطعاً

(شرح الخرشی، 55:5، شرح الزرقانی علی خلیل، 60:5)

(یعنی بلد معاملہ میں انقطاع شے کا اعتبار کیا جائے گا۔ جس شے میں تعامل واقع نہیں ہوا وہاں اگرچہ مثل موجود ہو پھر بھی اسے منقطع ہی سمجھا جائے گا۔)

غرض کساد کی صورت کبھی تو قلت رغبات کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور کبھی لوگوں کے ترک تعامل کی وجہ سے یا حاکم کے بین کر دینے کی وجہ سے بھی کساد کا وقوع ہو جاتا ہے۔ چاہے اب بھی وہ نقد عام دستیاب ہو۔ مگر انقطاع یہ ہے کہ نقد سرے سے دستیاب ہی نہ رہے اور بازار میں مفقود ہو جائے۔ اب بھی لوگوں کی رغبت پہلے کی طرح برقرار ہو اور ترک تعامل کی نوبت نہ آئی ہو۔

(33) الشرح الکبیر علی المقنع، 358:4

(34) زیلعی، تبیین الحقائق، 142:4

(35) شرح فتح القدیر، 383:5

(36) عالم گیر، فتاویٰ عالمگیری، 225:3

زیلعی، تبیین الحقائق، 142:4

(37) زیلعی، تبیین الحقائق، 142:4

(38) ابن عابدین، تنبیہ الرقود، 60:2

(39) رھونی، حاشیۃ الرھونی، 121:5

زرقانی، محمد بن عبدالباقی بن یوسف: شرح الزرقانی علی خلیل، المطبعۃ البہیہ، مصر، 1317ھ، 60:5

(40) السیوطی، قطع المجادلہ، 1:97-99

(41) دردیر، الشرح الکبیر علی المقنع، 8:4

بھوتی، شرح منتھی الارادات، 226:2

(42) امام ابو یوسف بھی اوّلاً یہی مسلک رکھتے تھے مگر انہوں نے بعد میں اس سے رجوع کر لیا۔

(43) مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ 750

(44) ابن عابدین، تنبیہ الرقود، 2:60-63

(45) ابن عابدین، تنبیہ الرقود، 2:60-61

(46) رھونی، حاشیۃ المدنی، 118:5

(47) نظام الدین، مفتی: نظام الفتاویٰ، دار العلوم دیوبند، 332:1

(48) قاسمی، مجاہد الاسلام مولانا: جدید فقہی مباحث، ادارۃ القران والعلوم الاسلامیہ، کراچی، 568:3

(49) اسلامی نظریاتی کونسل رپورٹ بر بلاسود بنکاری، آرٹیکل ا۔23,10

(50) مجلۃ البحوث الاسلامیہ، العدد الاول، ص185، 1395ھ

(51) مجمع الفقہ الاسلامی، قرارات وتوصیات، دار القلم، دمشق، ص93

(52) ایضاً، ص171-173

(53) ایضاً، ص202-203

54- International Journal of Islamic Financial Services Vol.2, No. 3

(55) قاسمی، مجاہد الاسلام، جدید فقہی مباحث، 568:3

(56) Sharit Law reports, Feb2000, P 336

(57) ایضاً: ص57433۔

(58) http://www.finance.gov.pk/law/riba_jud_2002.pdf

(59) ایضاً

(60) ایضاً

(61) ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ 520:29

(62) القرآن، 33:23

(63) ایضاً، 11:14

(64) ایضاً 23:2

(65) رشید رضا، المنار، مطبعۃ دار المنار، مصر، د۔ت، ج ا ص 159

(66) القرآن، 95:5

(67) ایضاً 19:1:2

(68) ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ج 2 ص 312

مجلّہ احکام العدلیہ، ص 41

(69) مرغینانی، الھدایہ مع شرح عبدالحی لکھنوی 179:5

(70) ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار، ص 5 ص 161

(71) ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ج ۲ ص ۳۱۲

الشربینی الخطیب، مغنی المحتاج، ج 2 ص 281

مجلّہ احکام العدلیہ، ص 41

(72) ابن قدامہ، المغنی، ج ۵ ص 239

(73) ابن قیم، اعلام الموقعین، 45:2

(74) العاصمی، عبدالرحمان: الدرر السنیہ فی الاجوبۃ النجدیہ، دارالافتاء، ریاض، 110:5

(75) بحوالہ "الفقہ علی مذاہب الاربع" ص 2 ص 262-265

(76) سیوطی، الاشباہ والنظائر، سیوطی، ص 357

(77) ایضا

(78) ایضا، ص 572

(79) مجمع الفقہ الاسلامی، قرارات المجلس، ص 97

(80) ابن عابدین، مجموع رسائل ابن عابدین، ص60

(81) شرح مجلّہ الاحکام العدلیہ

(82) مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی کھجور کو توڑی گئی کھجور کے بدلے بیچا جائے۔

(83) تفصیل کے لیے دیکھیے:

ابن عابدین، ردالمحتار، ج4 ص6

ابن ھمام، فتح القدیر، ج5 ص219

البدائع ج7 ص188

(84) ان مثالوں کے مراجع حسب ذیل ہیں:

سرخسی، المبسوط، ج17 ص158

ابن عابدین، ردالمحتار، ج4 ص469 ومابعد

زیلعی، تبیین الحقائق، ج5 ص5

(85) القرآن، 18:35

(86) ابن قدامہ، المغنی، 325:4

(87) Indexation of Financial Assets-An Islamic Evaluation,p.17-18

(88) An Introduction to money and Banking, p.460

(89) احمد بن حنبل، ابوعبداللہ بن محمد: المسند، المکتب الاسلامی، بیروت، ط2، 1398ھ، ج1 ص36

(90) بخاری، محمد بن اسماعیل بن ابراھیم الجعفی: الجامع الصحیح، دارالحدیث، قاہرہ، د۔ت۔، ج3 ص4

(91) مجلّہ احکام العدلیہ، دفعہ 4

(92) ملاحظہ ہو:

الشیرازی، ابواسحٰق: المھذب، مطبعۃ البابی الحلبی، مصر، 100:2

الشربینی الخطیب، شیخ محمد: مغنی المحتاج شرح المنھاج، مطبعۃ البابی الحلبی، مصر، 303:3 ومابعد

بھوتی، کشاف القناع، 381:5 ومابعد

ابن قدامہ، المغنی، 227:7

(93) مجلّہ الاحکام العدلیہ، دفعہ:27

(94) ایضاً، دفعہ:26

(95) القرآن، 29:2

(96) الاسنوی، جمال الدین: شرح الاسنوی، 891:3

(97) الآمدی، الاحکام، ج ۳ ص 11-12

(98) الاسنوی، شرح الاسنوی، ج 3 ص 89-90

(99) شرح المختصر، ج ۲ ص 314

(100) جصاص، الاحکام، ج 3 ص 11-12

(101) جصاص، احکام القرآن، 324:2، 24:3

(102) ابن قیم، اعلام الموقعین عن رب العالمین، المکتبہ التجاریہ الکبری، القاہرہ، 137ھ، ج 2، ص 156۔

(103) القرآن، 85:7، 85:7، 48:27

(104) ایضاً، 85:7

(105) ایضاً، 85:7

(106) ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، 2:6

ابن عربی، احکام القرآن، دار الفکر، بیروت، د۔ت، ج 7، ص 1063